بہار ۱۹۹۲ء

آج

ترتیب : اجمل کمال

نیّر مسعود — اسد محمد خان
حسن منظر — مسعود اشعر
انور خان — قمر احسن
فہمیدہ ریاض — صغیر ملال

معاصر اردو فکشن

تیرہ کہانیاں اور ایک ناول

آج کی کتابیں

E Books
WHATSAPP GROUP

آج

فروری - مارچ ۱۹۹۲

مینیجنگ ایڈیٹر
زینت حسام

اہتمام
آج کی کتابیں
بی ۱۲۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۷۵۸۵۰

کمپوزنگ
پبلشرز یونائیٹڈ
۸۷ دارالامان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

طباعت
ابنِ حسن پرنٹنگ پریس
ہاکی اسٹیڈیم کراچی

آج کا یہ شمارہ اردو کے معاصر فکشن کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ اردو کے ادبی جریدوں کی مروّج اصطلاح میں اسے افسانہ نمبر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ ایک کامیاب کوشش ہے تو آپ اس شمارے کی ہیئت اور اس کے مزاج کو افسانہ نمبروں سے قدرے مختلف پائیں گے۔ رواج سے روگردانی کرتے ہوئے، اس میں بڑے بڑے تسلیم شدہ ناموں کا انبار لگانے کی کوشش سے دانستہ احتراز کیا گیا ہے، کیونکہ ایسی کوشش کا نتیجہ بعض اوقات معیار کے سوال پر مفاہمت کی صورت میں نکلتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس انتخاب کو اردو فکشن میں موجود تمام یا اکثر رجحانات اور دبستانوں کا نمائندہ بنانے سے بھی گریز کیا گیا ہے، جو بذاتہ ایک لحاظ سے قابلِ قدر بات ہوتی، لیکن یہ اس جریدے کے مقاصد میں شامل نہیں ہے۔ ممکن ہے سونے طی اس احترازوگریز کو ایک نئی گروہ بندی کی کوشش سمجھنے پر مائل کرے، لیکن پُرخلوص اور بےتعصّب مطالعہ یقیناً اس بدگمانی کی تردید کر سکے گا۔

اس شمارے میں ایک مکمّل ناول اور تیرہ کہانیاں شامل ہیں۔ آٹھ ادیبوں کی یہ تخلیقات ان کے مخصوص ذاتی تخلیقی عمل اور فنّی ترجیحات کی آئینہ دار ہیں اور، اردو کے بعض ادبی دبستانوں کے طرزِعمل کے برعکس، کسی عائدکردہ ادبی یا غیرادبی نظریے کی پیروی یا تسلیم شدہ شخصیات یا رجحانات کی تقلید کا ناروا بوجھ نہیں اٹھاتیں۔ البتہ ان تخلیقات کا ایک جلد میں یک جا ہونا ایک جائز معنویت کو ضرور راہ دیتا ہے، جو اس جریدے کے مزاج اور سمت کی تشکیل کرتی ہے۔

اس شمارے کو تین حصوں میں ترتیب دیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں نیر مسعود، اسد محمد خاں، حسن منظر، مسعود اشعر، انور خاں اور قمر احسن کی تازہ کہانیاں شامل ہیں۔ دوسرا حصہ فہمیدہ ریاض کے ناول پر مشتمل ہے۔ تیسرا حصہ ایک بےحد باصلاحیت اور تازہ کار ادیب صغیر ملال کی کہانیوں کا انتخاب ہے جو جنوری ۱۹۹۲ میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ممکن ہے یہ مختصر انتخاب پڑھنے والوں کے ایک نسبتاً بڑے حلقے کی توجہ صغیر ملال کے سنجیدہ ادبی کام کی طرف مبذول کرا سکے جو اگر مہلت پاتا تو یقیناً اردو کے ادبی سرمائے میں بہت قابلِ قدر اضافہ کرتا۔

اجمل کمال

ترتیب

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

۱
نیّر مسعود

۹
بے خاندان کے آثار
اسد محمد خاں

۲۴
غصّے کی نئی فصل
حسن منظر

۳۴
بومیدین

۴۸
سونی بھوک

مسعود اشعر

٦١
نامحرم

انور خاں

٨٢
پھول کی پتّی سے

قمر احسن

٨٩
شیرِ آہوخانہ

E Books
WHATSAPP GROUP

٢

فہمیدہ ریاض

٩٩
گوداوری

۲

ناول

فهمیده ریاض

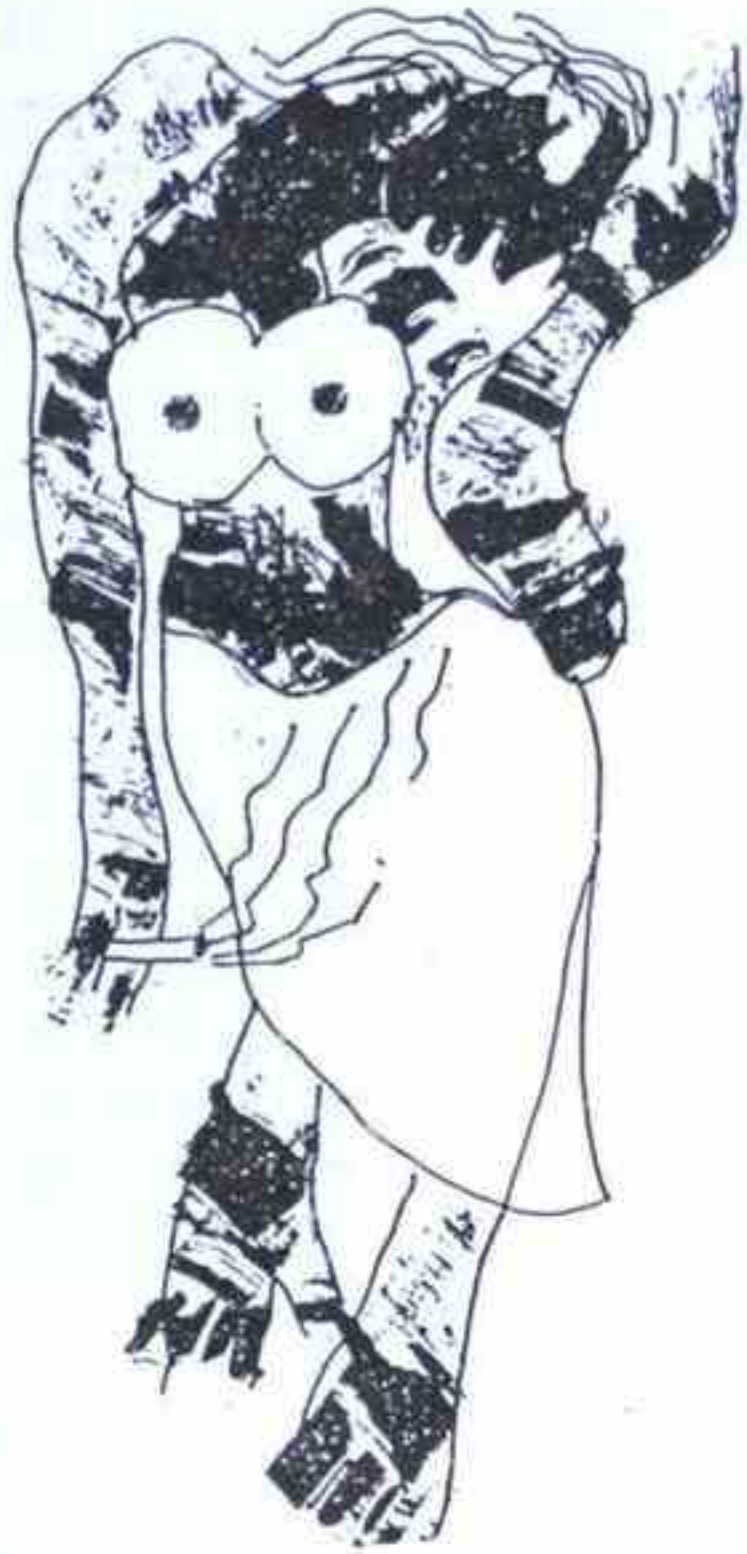

فہمیدہ ریاض

گوداوری

پہاڑی بس اسٹاپ پر اترتے ہی ایک مختصر سیّاح خاندان کے چھوٹے بڑے اور بچّے بےتابی سے اپنا سامان اٹھا کر اپنی عارضی، چھٹیوں کی قیام گاہ کی جانب دوڑ پڑے۔

زمین نے فوراً ان کے پیر پکڑ لیے۔ یہ میدان نہیں تھا۔ گھنٹوں بس میں بیٹھے بیٹھے انھوں نے آنکھوں سے گردوپیش کے تمام مناظر بدلتے دیکھے تھے اور میدانوں کو پہاڑوں میں ڈھلتے دیکھا تھا۔ لیکن آنکھوں کی اطلاع بےسود تھی؛ ان کی ٹانگوں کو میدان ہی کی عادت تھی۔ اوبڑکھابڑ پہاڑی راستے پر ذرا سی دیر میں وہ پسینے پسینے ہو گئے۔ ہانپنے لگے۔ جوتوں کی طرف نظر ڈالی تو پہچانے نہیں جا رہے تھے؛ بالکل سرخ، سرخاسرخ، جیسے پسی ہوئی اینٹ مَل دی گئی ہو۔

ناچار بوجھ تلے ہانپتے وہ الٹے قدموں لوٹے۔ بس اڈے سے قلی کیے۔ دھوتیوں کے لنگوٹ کسے دو گہرے سانولے قلی ان کے چھوٹے بڑے سوٹ کیس، ناشتےدان، تھرمس اور ٹرانزسٹر ریڈیو سنبھالے، پہاڑی کی پگڈنڈی کی چک پھیریاں چڑھنے لگے۔ پہاڑی کے عین سرے پر ان کی قیام گاہ تھی۔ مہاراشٹر کے مغربی کنارے پر اس پہاڑ کو بیسویں صدی کے آغاز میں انگریزوں اور بمبئی اور سورت کے بوہروں، خوجوں، اسماعیلیوں اور پارسیوں نے بسایا تھا۔ بمبئی کی گرمی سے جب انگریز کا جی اُوبھا تو انھوں نے پہلے کھنڈالا اور پھر اس نسبتاً سستے پہاڑی مقام پر ریل کی پٹریاں بچھا دی تھیں۔ ان پٹریوں پر اب بھی دو انجن والی کھلونا سی ریل گاڑی بھاپ چھوڑتی چھک چھک کرتی آتی تھی۔ یہ کنبہ ریل وقت پر نہ پکڑ سکنے کی وجہ سے بس سے آیا تھا۔ تمام راستے انھیں پہاڑ کی گولائیوں میں ریل گھومتی نظر آتی رہی تھی۔ بمبئی سے تھوڑے سے ہی فاصلے پر، جہاں سے یہاں تک پہنچنے میں انھیں بمشکل چار پانچ گھنٹے لگے تھے، یہ تقریباً غیرپامال علاقہ جیسے مراٹھالینڈ کے پیٹ میں گھسا لیٹا تھا۔ بس اسٹاپ پر مورتیوں کی سی مراٹھنیں شوخ کچّے رنگوں کے سنہری کناریوں والے کاشٹے رانوں تک لنگوٹ کی طرح کسے سامان ڈھو رہی تھیں۔ کتنوں کے گود کے بچے ان کے سینوں، بازوؤں اور پیٹھ سے چمٹے تھے۔ ایک کو مزدوری مل جاتی تو دوسری موٹے موٹے کڑوں سے کہنی تک بھری بانہیں بڑھا کر اس کا بچہ سنبھال لیتی۔ ان کی سانولی پنڈلیاں ریشم کی طرح چکنی تھیں؛ ان پر بالکل بال نہ تھے۔ (آنے والے گروہ میں جو عورت تھی اس نے اپنی ایک گاؤں سے تعلق رکھنے والی سہیلی سے

آنکھیں پھاڑ کر پوچھا تھا، "کیا ان کی ٹانگوں پر بال ہی نہیں اگتے؟" اس نے قہقہہ لگا کر کہا تھا، "اگتے کیوں نہیں!" اور اسے بتایا تھا، "اکھاڑتی ہیں دھاگے سے۔") کسے کسائے سانولے مراٹھے چائے اور پان بیڑی سگریٹ بیچ رہے تھے اور کمپاکولا کی گرم بوتلیں، جو ہر روز بمبئی کے مضافات سے ٹرک ان پہاڑی سلسلوں پر پھینک جاتے تھے۔ مردوں نے بھی دھوتیوں کو لنگوٹ کی طرح مڑھ رکھا تھا۔ ان سب کے بالوں اور بازوؤں اور سینوں پر اس پہاڑ کی سرخ مٹی کی تہہ سی جم رہی تھی جیسے غازہ لگایا ہو۔

چھٹیاں گزارنے کے لیے آنے والا یہ کنبہ بمبئی کے ایک مسلمان سرمایہ دار کی وِلا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اب خوشی سے اچھلتاکودتا جامنوں کے درختوں کے جُھنڈ میں کپڑے میں سوئی دھاگے کی طرح گزرتی پگڈنڈیوں پر چڑھ رہا تھا۔ درختوں تلے خودرو جھاڑیوں میں اور لمبی لمبی گھاس میں ننھے منے جنگلی جانور کھٹ پٹ کر رہے تھے۔ ایک گلہری نے تیزی سے دوڑ لگائی۔ اچانک اس قافلے میں شامل نوجوان لڑکی کی مختصر چیخ ابھری اور پھر ایک پرمسرّت قہقہہ۔ اس کے عین سر پر سے ایک سیاہ رُو لنگور نے جامن کے ایک پیڑ سے دوسرے پیڑ پر بےحد لمبی دُم لہرا کر زقند بھری تھی۔

"ارے لنگور! لنگور!" ان کے قدم راستے ہی میں گڑ گئے۔ سب منہ اوپر اٹھا اٹھا کر تاکنے لگے۔ گہرے دبیز پتّوں کی گھٹی بوٹی جالیوں سے چھن چھن کر آتی سورج کی کرنوں کے جال میں بھنوروں کی طرح کالی، رس سے تربتر جامنوں کے گچھوں میں انھیں بیسیوں ہنستے اور منہ چڑاتے لنگور نظر آئے جو اپنی سفید، مگر پہاڑ کی مٹی سے سرخ، پلکیں جھپکاتے، بڑی بڑی بادامی آنکھوں سے انھیں تاک رہے تھے۔

مراٹھا قلی ہنسا۔

"ہاں ادھر لنگور بہت ہے۔ ان سے بچ کر رہنا صاحب۔ چیزیں اٹھا کر لے جاتا ہے اور... اور پنجہ بھی مار سکتا ہے۔"

مگر بچے لنگوروں کی قربت کے خیال ہی سے خوشی سے بےقابو ہو رہے تھے۔ وہ عمر کے بےخطر مقام پر تھے؛ بڑکی جو ابھی سولہ کی نہ ہوئی تھی؛ نیکر میں پیشاب کر کے رونے والا چیکو؛ اور ککلی جسے سب شیدیانی کہتے تھے کیونکہ اس کے بال گھنگریالے تھے اور چھوٹا تراشنے پر شیدیوں کے بالوں کی طرح گھنڈی دار ہو جاتے تھے۔

اس گروہ کا سربراہ ایک درازقد تنومند سانولا مرد تھا، باپ۔ ایک عورت، جسم کے کسی ضروری حصے کی طرح، اس کنبے کے ساتھ لگی تھی؛ گوشت اور خون کے ان پُتلوں کو پیدا کر کے اب انھیں پالنے پوسنے کا کام کرتی ہوئی، ان کی حرکتوں پر روتی، ہنستی اور پریشان ہوتی ہوئی؛ یہ ماں تھی۔

خوش قطع وِلا کا دروازہ کھلتے ہی ان پر اس کے کشادہ اور آرام دہ ہونے کا خوش گوار انکشاف ہوا۔ جلدی جلدی تمام کمروں کے دروازے کھولتے، بچّے دھماچوکڑی مچانے لگے؛ الگ الگ کمروں پر قبضہ کرنے کے لیے دھینگامشتی میں مصروف ہو گئے۔ سب سے اچھے منظر پر کھلنے والی کھڑکی جس کمرے میں تھی، وہاں بڑکی نے فوراً اپنا سوٹ کیس جما دیا اور الماری

میں سوٹ کیس سے نکال نکال کر کپڑے ٹانگنے لگی جنھیں وہ دلّی سے استری کر کے لائی تھی، اور پورے سفر کے دوران گڑگڑا کر ان کی استری نہ ٹوٹنے کی دعائیں مانگتی رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔ آنے والے پُرلطف وقت کی قوی امید سے اس کا دل گنگنا رہا تھا۔

بس میں آتے ہوئے، اڈے تک پہنچتے پہنچتے اس نے راستے میں کئی خوبصورت لڑکے دیکھے تھے جو انھی کی طرح چھٹیاں گزارنے شاید بمبئی سے آئے تھے اور پہاڑ کے سرخ، تنگ، چکردار راستوں پر گھڑسواری کر رہے تھے۔ قلی جاتے جاتے اس ولا میں رہنے والی، اس کی دیکھ بھال کی ذمےدار اُشا کو کھانا بنانے کا سامان خرید کر دینے کے لیے ان سے پیسے لے گیا تھا۔

جب تک اُشا مکئی کے تیل میں (جو وہاں وافر مقدار میں دستیاب تھا) پتّوں سمیت مُولی کی بُھجیا، سب طرح کی مِلی ہوئی دال اور حیرت انگیز حد تک نرم اور ذائقےدار مراٹھی چپاتیاں پکا کر ان کے لیے لائے، بڑکی نہادھو کر، جینز اور بلاؤز پہن کر سورج کی کنکنی دھوپ میں اپنے لمبے سیاہ ریشمی بال سکھا چکی تھی، اور اب اپنا تمتماتا، اشتیاق سے گلابی مکھڑا لیے بس فوراً ان پگڈنڈیوں پر بےنیازانہ چہل قدمی کرنے کے لیے بےتاب تھی جہاں خوبصورت لڑکے گھڑسواری کر رہے تھے۔ وہ اتنی پُرکشش تھی کہ کوئی بھی لڑکا اسے دیکھ کر کم از کم دل ہی دل میں اشتیاق اور حیرت کی سیٹی مارے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ بڑکی بظاہر بےنیازی سے فوراً منھ پھیر لیتی، لیکن خوشی اور اضطراب بیہودی سے کہاں چھپتا تھا! مارے خوشی کے بتّیسی باہر نکلی رہتی۔ اس کی پوری کھلی، شفاف، چمک دار آنکھیں چکرمکر گھومتیں اور میلوں دور کسی ہاتھ پیر سے درست لڑکے کو دیکھ لیتیں۔ ما کی یہ بڑی والی ذہین اور حسّاس بیٹی پڑھائی پر بالکل توجہ نہ دینے کے باعث ابھی ابھی دسویں میں فیل ہوئی تھی۔ اس کی سپلیمنٹری آئی تھی۔

تب تک با لمبے سفر کی کسل مندی اتارنے کے لیے مٹی کی مہک سے بھرے کمرے میں نرم گدیلے والے دوہرے جہازی بستر پر مدّھم، مَسکی ہوئی خوشبو والی چادروں سے خود کو ڈھانپ کر ایک نیند لے چکا تھا۔ چیکو کے رونے پر اس کی پیشاب والی نکر اتار کر ما اسے بجلی کی راڈ سے بالٹی میں پانی گرم کر کے نہلا چکی تھی، اور اپنی بڑی باجی کے بےفکرےپن کے براہِ راست ردعمل میں چھ برس کی عمر ہی میں کسی اسکول ہیڈمسٹریس کی طرح سنجیدہ، غصیلی اور پڑھاکو بن جانے والی ککلی کا ہاتھ منھ دھلا کر اسے نئی پھول دار فراک پہنا چکی تھی۔ اب ما خود نہانے جانے والی تھی کہ اُشا کھانے کی سینی لیے دروازے پر آ پہنچی۔

پانچوں کی نظریں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ کھڑی تھی وہاں گندمی رنگ کی ایک حسینہ۔ اس نے کام کرنے والی گھاٹنوں یا پہاڑنوں کی طرح کاشٹے کا لنگوٹ نہیں کس رکھا تھا؛ باقاعدہ ساری پہنے تھی۔ تیس پینتیس کا سن رہا ہو گا۔ پتلی پتلی بھنویں تھیں۔ بڑی آنکھیں۔ نازک ناک میں البتّہ وہ سبک سا مراٹھی طرز کا ترنج نما زیور ڈالے تھی جو اس کے لبوں کو چُھو رہا تھا۔

"میں ہوں اُشا،" اس نے برتن میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "طاہر بھائی کا بمبئی سے فون آیا تھا۔ آپ کے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ میں ہی یہاں بنگلے کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔"

"اچھا! اچھا---چھا---! تو آپ ہیں--- اُشا۔ آئیے آئیے!" با نے فوراً ریشہ خطمی ہو کر کہا۔

خوشی سے وہ فوری طور پر بےحال بلکہ نڈھال ہو گیا تھا۔ اس کا یہی حال تھا۔ کوئی بھی اور کیسی بھی عورت ہو، وہ ریشہ خطمی ہو جاتا تھا۔

اس صورتِ حال کو دیکھ کر بڑکی نے کوفت سے ہونٹ پچکائے۔ چمک دار، چکرمکر گھومتی آنکھوں سے با کو تاکا۔ ما نے بھی اس کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور گویا انھوں نے مل کر کہا، "یہ ہو گئے ریشہ خطمی!" اس پر ما اور بڑکی کی ہنسی چھوٹ گئی، جسے انھوں نے فوراً دبا لیا۔ لیکن با کچھ نہ سمجھا۔ وہ سمجھنے کی حالت میں باقی ہی کہاں رہا تھا! ککلی اور چیکو تیز بھوک میں خوشی کی چیخیں مارتے ہوئے کھانے اور پھلوں پر پل پڑے۔ اُشا تازہ چپاتی ڈالنے کے لیے باہر چلی گئی۔ ذرا دیر میں جب وہ چنگیر لائی تو ما نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ایک حسین عورت تھی؛ اپنے لائے ہوئے سلاد کی ککڑی کی طرح نرم اور لچکیلی، اور اپنی بنائی ہوئی نرم ذائقےدار مراٹھی چپاتی جیسی نمکین۔

کھانے کے بعد با نے فوراً پیش کش کی کہ بچوں کو ما سیر کرانے لے جائے؛ وہ خود وِلا میں کچھ دیر سونا چاہتا ہے۔ صبر اور تحمّل سے ما نے یہ پیش کش مسترد کی، اور چیکو، ککلی اور بڑکی کے بلند آواز مطالبوں کی گونج میں بادلِ ناخواستہ با انھیں سیر کرانے لے گیا۔ کھڑکی سے لگی ما دور تک ان کے ہنسنے اور لنگوروں کی چھلانگوں پر ان کی مسرت بھری چیخوں کی آوازیں سنتی رہی جو پہاڑی کی ڈھلانوں میں گونج رہی تھیں۔

ooo

اب وِلا میں خاموشی تھی۔ یہاں اب کوئی نہ تھا۔ دو عورتیں، جدا جدا، اپنے کاموں میں مصروف۔

ما نہائی۔ ولا کے پرانے، ٹائیلز لگے غسل خانے میں سیلن تھی، اور کائی، جیسے انھیں کسی نے مدّت سے صاف نہ کیا ہو۔ شاید اس سیزن میں یہ کمرے اور غسل خانے اور الماریاں پہلی بار کھلی تھیں۔ پانی اس کے اداس بدن پر یخ تھا۔ وہ بجلی کی راڈ سے ٹھیک پانی گرم نہ کر پائی تھی اور وقت سے پہلے اسے نکال لیا تھا۔ پھسلتے پیروں سے، ساری لپیٹ کر، ما باہر آئی۔ احاطے میں سہ پہر کی کمزور پڑتی دھوپ پھیلی تھی۔ اس نے احاطے کی وسعتوں پر نظر ڈالی۔ "ارے! یہاں تو ایک جُھولا بھی ہے۔" بچپن کی کوئی امنگ سرک کر اس کے بدن میں سما گئی۔ وہ خوشی سے تیز قدم بڑھاتی جھولے پر جا بیٹھی۔ دائیں طرف، دور، جامنوں کا جُھنڈ تھا جن پر لنگور قلابچیں بھر رہے تھے۔ ما جھولے میں جھولی۔ اس وقت یہاں کوئی نہ تھا؛ وہ جو دل چاہے کر سکتی تھی۔ مگر انجان بدن نے امنگ بھرے دل کا ساتھ نہیں نبھایا۔ لمبی اور اونچی پینگھ لینے سے ما کا سر چکرانے لگا۔

جھولے سے اتر کر وہ گھاس کے تختے پر بیٹھ گئی جو خودرو سبز چیتھڑوں کی طرح اِدھر اُدھر بکھری تھی۔ سرخ مٹی میں سبزہ اسے بہت خوبصورت لگا۔ اس نے وِلا پر نظر دوڑائی۔ وِلا

سے متصل دو تین آؤٹ ہاؤسز تھے۔ دو میں تالا پڑا تھا۔ ایک کوٹھری کھلی تھی جس کی چمنی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اُشا اسی کوٹھری میں رہتی تھی۔ ولا کے باورچی خانے کو سنبھالنے کے لمبے چوڑے کام سے بچنے کے لیے وہ اپنی کوٹھری ہی کے چولھے پر ولا میں ٹھہرنے والے مہمانوں کا کھانا بنا دیتی تھی۔

بال سکھاتی ما، ٹہلتی ہوئی اشا کی کوٹھری کی طرف چل دی۔ جانے کیوں اس نے دروازے پر دستک نہ دی۔ شاید وہ کسی ناخوشگوار خیال کی گرفت میں تھی۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا، صرف بھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ کے ذرا سے دباؤ سے کھل گیا۔ کوٹھری کے نیم اُجالے میں اُشا نے، چولھے کے سامنے بیٹھے ہوئے، اسے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر وہ مسکرا کر کھڑی ہو گئی۔

"اَو بائی---" اس نے کہا۔

کوٹھری کھولتے ہی ایک لطیف، مگر نہایت واضح سگندھ کا بھبھکا جیسے ما کے چہرے سے ٹکرا گیا۔ مہک اتنی سُرعت سے اس کے نتھنوں میں گھُسی، اور اتنی غیرمتوقع تھی، کہ پل بھر کو ما نے جھٹکے سے سر پیچھے کیا جیسے سچ مچ کسی چھوئی جانے والی شے سے چہرہ بچاتی ہو۔ یہ ایک مَسکی ہوئی خوشبو تھی جس میں گرم مسالوں اور باسی پھولوں کے ساتھ مٹّی کی دھانس شامل تھی، اور جو شاید اپنی لطافت کے باعث حیرت انگیز طور پر خوش گوار بن گئی تھی۔

کوٹھری کے مدّھم اجالے میں ما نے قدم بڑھایا۔ یہ کوٹھری عمودی لمبان میں بنائی گئی تھی اور بالکل سادہ سی تھی۔ حالاں‌کہ یہ وِلا کا حصہ تھی، لیکن اس کی بناوٹ کسی جھونپڑی کی طرح تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ تین پتھروں کا چولھا بنا دیا گیا تھا (جیسا پورے ہندوستان میں ہزاروں برسوں سے چلا آ رہا ہے) جس کے پاس راکھ بکھری تھی۔ ساتھ برتن بھانڈے دھرے تھے۔ مٹی کے کونڈے میں ہلدی کی گانٹھیں اور لہسن پیاز رکھا تھا۔ بانس جوڑ کر کوٹھری میں پارٹیشن سا کھڑا کر دیا گیا تھا جس نے کھانا پکانے کے حصے کو باقی کی کوٹھری سے جدا کر دیا تھا۔ پارٹیشن سے پرے ایک کھاٹ پر اُشا کا بستر بچھا تھا۔ دیوار کے ساتھ اوپرتلے ٹین کے دوتین صندوق تھے جن کے اوپر دیوار کی کیل میں ٹنگا آئینہ تھا اور اس کے بالکل ساتھ سات رنگوں کی دھنک میں رنگی معصوم سی سونڈ والے گنیش جی کی مورتی دیوار پر آویزاں تھی۔

وہ اُشا سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی جیسی دو عورتوں میں آپ ہی آپ نکل آتی ہیں۔

"جب مہمان نہیں ہوتے تب میں پیڑیاں بناتی ہوں،" اس نے ما کو بتایا اور بانسوں کی جالی میں اُڑسا اپنے کے پتوں کا گٹھا دکھایا۔ اس کے ساتھ بانس کا ایک کھوکھلا تنا دیوار کے سہارے ٹکا تھا۔ اتنا گھیردار بانس ما نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ (ما نے تو بانس ہی ٹھیک سے اور غور سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہمیشہ بانس کو کسی نہ کسی چیز میں لگا ہوا ہی دیکھا تھا جس پر کوئی غور نہیں کرتا۔ ما نے حیرت سے اس ستون جیسے کھوکھلے نباتی عجوبے کو دیکھا جسے برتن کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا!)

"پانی کمتی ہوتا ہے اِدھر ما،" اُشا نے کہا۔ "آج آپ سب نے سَنان کیا۔ ایک دم کھلاس ہو گیا۔ پینے کا پانی میرے گھڑولے سے لے لینا۔ ٹنکی دن میں ایک بار چلتی ہے۔ ٹنکی چلانے والا

سِواجی سویرے آئے گا۔"

(تھوڑی دیر بعد، باتوں ہی باتوں میں، ما کو معلوم ہوا، لم تڑنگ سِواجی صرف سویرے ہی نہیں، رات کو بھی آتا ہے۔ ٹنکی چلاتے نہیں، پہاڑ کی ٹھنڈی رات میں آشا کے سنگ سونے۔ لیکن جب بنگلے* میں مہمان ہوں تو پھر اس کو مشکل پڑتی ہے۔)

آشا کا کوئی بچّہ نہ تھا۔ اس کا شوہر تھا یا نہیں یا کہاں گیا، اس بات کو وہ بالکل گول مال کر گئی۔

"ہاں تھا وہ الوتےدار بلوتےدار۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

"ہاں؟" ما نے حیرت سے ہونٹ پر انگلی دھر کر پوچھا۔

"ترکھان تھا۔"

پھر ما کو پتا چلا۔ یہاں الوتےدار بلوتےدار کاریگر کو کہتے ہیں۔ مراٹھی محاورے میں فارسی کی جڑاوٹ سے وہ پہلے کافی چکرائی۔ پولیس والوں کو معاملت دار کہتے تھے، زمین داروں کو کھاتے دار۔ لیکن مراٹھے تو اپنے بادشاہ کو بھی پیشوا کہتے تھے۔ وہ دل میں ہنسی۔ تاریخ داں اس بات پر حیران تھے۔ مغلوں سے جتنا لڑتے تھے، اتنی ہی فارسی بولتے، گویا جل جل کر۔

(بعد میں کسی نے اسے بتایا۔ برسوں پہلے آشا کا آدمی چلا گیا تھا۔ بمبئی۔ فلم ایکٹر بننے۔ کسی نے اس سے کہا تھا وہ بہت سُندر ہے، ہیرو بن جائے گا۔ پھر اس کی کوئی خبر ہی نہ آئی۔)

آشا پڑھی لکھی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی پہاڑ پر بوجھا ڈھوتی پہاڑنوں سے زیادہ مہذّب معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک ذہین عورت تھی۔ اس نے ما کو بتایا کہ وہ طاہر بھائی کے ساتھ کئی بار بمبئی ہو آئی ہے۔ کچھ مہینے تک اس نے بمبئی میں طاہر بھائی کی فیملی کی خدمت گزاری بھی کی ہے۔ وہ باپ کی وجہ سے واپس آ گئی جو ابھی زندہ ہے اور نیچے کہیں ترائی میں رہتا ہے۔ بمبئی میں طاہر بھائی کا شاندار بنگلا تھا۔ ان کا عطر کا کاروبار تھا۔ ما اور با کی طاہر بھائی سے ملاقات دراصل طیّب بھائی کے ذریعے ہوئی تھی۔

ما اور با اسّی کی دہائی میں کسی بَھینکر سَنکٹ میں پڑ کر پڑوسی ملک پاکستان سے بھٹکتے اِدھر آ نکلے تھے۔ وہ دلّی میں رہ پڑے تھے۔ یہ دو سیاسی جیوڑے تھے۔ رفتہ رفتہ یہاں ان کے ہم خیال دوستوں کا وسیع حلقہ بن گیا تھا۔ ان میں کتنے ہی کمیونسٹ تھے۔ طیّب بھائی ایک جیّد عالِم اور سیاسی کارکن تھے۔ وہ ہندو مسلم فرقہ واریت کے خلاف تقریباً کل وقتی تحریک چلاتے تھے۔ اب سُوئےاتفاق دیکھیے کہ ان کا تعلق ادے پور میں گڑھ رکھنے والے ایک چھوٹے سے مسلمانوں کے فرقے سے تھا۔ کسی جِن کی طرح وقت نکال کر وہ اس فرقے کے پیشوا کے ظلم و ستم کے خلاف ایک اصلاحی تحریک بھی چلاتے رہتے۔ ان کے زیادہ تر دوست اس حرکت سے عاجز رہتے۔ روشن خیال مسلمانوں کا، اور ہندوؤں کا بھی، خیال یہ تھا کہ ایک چھوٹے سے، رائی جتنے فرقے کو کیوں چھیڑا جائے۔ بھئی کرنے دو جو ان کا دل چاہتا ہے۔

"طیّب بھائی،" ما پیار سے کہتی۔ "آپ کا بنیادی کام اتنا اہم ہے۔ آخر کیوں آپ اپنے فرقے کی اصلاح کے پیچھے پڑے ہیں؟ خواہ مخواہ اپنے لیے مزید مشکلات پیدا کرتے رہتے ہیں؟"

طیب بھائی کے سینکڑوں ہندو مسلمان سکھ پرستار ایسا ہی کہتے۔ کسی کو بھی اس فرقے کی اصلاح سے دلچسپی نہیں تھی۔

بچوں کی سی معصوم شکل والے طیّب بھائی کھچڑی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے، گول مٹول چہرے کو دائیں بائیں گھماتے، عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے بڑی بڑی سیاہ گجراتی آنکھیں اور بھی پھیلا کر کہتے:

"یہ لیجیے! اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ تو سب سے اہم مشن ہے۔ اس فرقے کی اصلاح تو سب سے زیادہ ضروری ہے۔"

سب لوگ اپنا سا منھ لے کر رہ جاتے۔

طاہر بھائی عِطر والے اسی اصلاحی تحریک کے حمایتی تھے۔ تگڑا ٹیکس وصول کرتے تھے اس فرقے کے پیشوا، اور جو نہ دے سو برادری باہر۔ سنا ہے قبرستان میں دفن ہونے کی جگہ بھی نہ دیتے تھے۔ (سارے چھوٹے فرقوں کی طرح ان کے فرقے کا بھی علیحدہ قبرستان تھا۔)

"ارے تو لعنت بھیجیے،" لوگ کہتے۔ "عام قبرستان میں دفن ہو جائیے۔" (لوگوں کا مطلب ہوتا تھا کہ اپنے مُردوں کو عام مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دیں۔)

وہ بےبسی سے منھ دیکھتے۔ "آپ سمجھ نہیں رہے ہیں۔ یہ تو ایسا ہے کہ گویا... اب کوئی مسلمان اپنے مولوی جی سے ناخوش ہو تو آپ کہہ دیں: تو بھئی سیدھے سادھے چتا کیوں نہیں جلا لیتے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ظلم کیوں برداشت کریں۔"

اصل بات یہ تھی کہ ان میں سے کوئی اس فرقے کو چھوڑنا نہ چاہتا تھا جو راجپوتانے سے کسی سامری عمل سے گجرات تک جا پہنچا تھا۔ طیّب بھائی کے چکر میں کتنے ہی عام مسلمانوں نے اس کے موجودہ پیشوا کی ظلم کی داستانیں صبر اور تحمّل سے سنی تھیں اور تاسّف سے "چہ چہ!" کہا تھا۔ کس طرح وہ دین کے بنیادی مثالی اصولوں سے بھٹک کر گمراہ ہو رہے ہیں۔ طیب بھائی کے منھ پر کون کہتا کہ عام مسلمان اس فرقے ہی کو صریحاً خواہ مخواہ سمجھتے ہیں۔

"کیا ضرورت تھی بھئی!" وہ چپکے چپکے آپس میں کہتے۔ "ختم کریں یہ احمقانہ پاکِٹس۔ اصل مقابلہ کفّار سے ہے۔ اب سب کے سامنے اپنے گندے کپڑے دھونا! لاحول ولا..."

مگر طیب بھائی سے کوئی کیا کہتا! طیب بھائی نمازی تھے، پنج وقتہ۔ (اپنے فرقے کے مطابق ادا کرتے تھے۔) اور مسلم نشاۃ ثانیہ کے لیے رات دن ایسے جی توڑ کر محنت کرتے تھے کہ عام مسلمان دیکھنے سے اپنی کم مایگی اور کم عملی پر شرمندہ ہی ہو سکتے تھے۔

طاہر بھائی کا ذکر سن کر، اُشا سے باتیں کرتے کرتے، یہ سارے خیال ما کے ذہن سے آہستہ رفتار لہروں کی طرح گزرے۔

وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر اٹھتے اٹھتے ما سے رہا نہ گیا۔ وہ ایک تردّد میں مبتلا تھی۔ با کے ریشہ خطمی ہونے سے اس انجان پہاڑی مقام پر کسی ناخوشگوار صورتِ حال سے خود کو، اور اپنے پورے کنبے کو (بشمول با)، بچانا چاہتی تھی۔ اس تردد کے ہاتھوں ہار کر اس نے اُشا سے کہا:

"بچوں کے با ذرا... ریشہ خطمی ہیں۔"

اُشا نے اسے سادگی سے دیکھا۔ پھر اس کی نگاہیں گہری ہو گئیں۔ اس نے غور کیا کہ ما کے لہجے میں غصّہ یا جلن نہیں تھی۔ بس ایک گہری اور طویل تھکن!

وہ اسے دیکھتی رہی۔ پھر کالی لمبی پلکیں جھپکائے بِنا، اس نے ما سے عجب بےخوفی سے کہا:

"مرد کی جات ایسی ہی ہوتی ہے بائی۔ مرد کتّا ہے! آپ کیوں پھکر کرتی ہے؟ مرد لوگ اِدھر اُدھر ڈبکی لگا لیتا ہے۔ اس کا کچھ گھِس تو نہیں جاتا۔ اور نہ عورت کا کچھ گھِس جاتا ہے۔ دونوں جیسے کے تیسے رہتے ہیں۔"

"نہیں، میں فکر نہیں کرتی،" ما نے کچھ بددلی سے ہنس کر کہا۔ "مگر... میں نے تمھیں بتا دیا ہے۔"

"ضرورت نہیں تھی،" اُشا نے کہا۔ "میں کیا آدمی کی آنکھ نہیں پہچانتی؟ مگر... آپ پھکر نہ کرو۔"

ما اس سے رخصت ہونے لگی۔ کھلے دروازے میں اس نے مڑ کر کہا: "اچھا میں چلتی ہوں،" لیکن اس کا دھیان ہٹ گیا۔ سورج اب دروازے کے عین سامنے آ گیا تھا۔ کھلے دروازے سے داخل ہونے والی لمبی ترچھی کرنوں نے کوٹھری کی دیوار روشن کر دی تھی۔ ما کی نظریں دیوار پر جم کر رہ گئیں جہاں قطار میں ان گنت نقش و نگار بنے تھے۔ انتہائی عجیب و غریب، مستطیل اور مثلثہ چھ پتّوں والے پھول جن کا زرگل کا حصّہ اتنا چوڑا تھا کہ پھول سورج معلوم ہو رہا تھا؛ کئی قسم کے ہلال، یا شاید وہ خم کھائے ہوئے سینگ ہوں؛ مچھلی، مچھلی کے کانٹے جیسا ہک جو ہندی کی "ٹ" سے مشابہ تھا۔ ما اچانک حیرت کے ریلے میں انھیں دیکھتی رہ گئی۔ "یہ کیا ہیں؟" اس نے بےاختیار پوچھا۔

اُشا ہنسی۔ "دیوی دیوتا ہیں ما۔"

کسی اسپاٹ لائٹ کی مانند گھُستی سورج کی شعاعوں میں ما حیرت سے تکتی رہ گئی۔ اسے مور کا پنکھ نظر آیا۔ اسے جو نظر آیا وہ ہوبہو آم جیسا تھا۔ آم! آم دیوتا ہے! لنگڑا ہو گا کہ سندوری؟ اس کے دل نے ہنس کر سوچا۔ آم میٹھا ہوتا ہے۔ میٹھا ہی تو نہیں، خوشبو بھی تو غضب کی۔ مرزا غالب کو پسند تھا آم۔ اس کا دیوتا بن جانا کیا برا تھا۔ شاید آم لوگوں کا پیٹ بھرتا ہو، اس نے سوچا۔ اسے یاد آیا مہاراشٹر کا آم جہازی سائز کا ہوتا ہے؛ ایک آم دو جنوں کی ایک وقت کی خوراک کے لیے کافی۔ اتنا سرخ کہ سیاہ لگتا تھا۔ سیاہ آم۔ الفانسو! دلی میں تو پچاس روپے کا ایک ملتا ہے۔ اس کے دل نے آم کو پرنام کیا۔ ایک ہنسی بھرا پرنام۔ "میٹھے ہوں اور بہت ہوں،" ما نے دل ہی دل میں کہا۔ اور بمبئی کا سوچا جہاں میرٹھ کا باسی فلم ایکٹر

بھارت بھوشن مرزا غالب کا سوانگ رچاتا تھا اور بہت حسین غالب نظر آتا تھا۔ (ما میرٹھ کی تھی۔)

پھیکے گیرو سے بنے ان نقوش کو مسحور ہو کر دیکھتی، جنھیں سہ پہر کی روشنی نے کوٹھری میں گھس کر اچانک دمکا دیا تھا، آخر وہ اُشا کو اس کے دہلیز سے قدم پیچھے ہٹانے یا دوبارہ اندر آنے کا منتظر دیکھ کر کچھ شرمندہ ہو گئی اور واپس جانے کو مڑی۔ میں انھیں پھر کبھی آ کر تفصیلاً دیکھوں گی، اس نے سوچا۔ جاتے جاتے اُشا نے دھیرے سے کہا:

"رات کو ورانڈے کی پرلی والی بتّی دس بجے تک گل کر دینا بائی۔ نہیں تو--- سواجی سردی میں کھڑا رہے گا۔"

ما مسکرا کر "اچھا" کہتی ہوئی اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ مسکرا تو وہ دی تھی لیکن اب اسے اور فکر لگ گئی۔ بابا کی کہیں پٹائی نہ ہو جائے۔ وہ کمرے میں بستر پر بیٹھی کچھ دیر ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھے سوچتی رہی۔

پھر اسے خیال آیا۔ چیکو کے نہانے کا پانی ٹھیک سے گرم نہیں ہوا تھا۔ چیکو کو کہیں زکام نہ ہو جائے۔ بڑکی کی نظر کسی لڑکے پر نہ جا پڑے۔ یہ بات بھی یقینی تھی اور خاصی کوفت کا باعث۔ اور ککلی؟ بس ککلی ہی تو ٹھیک تھی۔ چھٹیوں تک میں ہوم ورک کرنے کے لیے بستہ ساتھ لائی تھی۔ اس کی ننھی ہیڈماسٹرپانی! اسے کبھی کسی پریشانی میں نہ ڈالنے والی اس کی چھوٹی سی شیدپانی! دل ہی دل میں ککلی کو پیار کر کے وہ بستر پر لیٹ گئی۔ سفر سے تھکی ہوئی ما فوراً نیند میں ڈوب گئی۔ بستر اس کے لیے جیسے ایک جزیرہ تھا۔ باہر سے پھر نئی تیز پہاڑی ہوا میں جامنوں کے پتّے اور سرخ غبار اڑ رہا تھا۔ ما کے سپنے میں سواجی ٹنکی والا بابا کے پیچھے کوئی خطرناک ہتھیار اٹھائے دوڑ رہا تھا۔

ooo

رات پڑ چکی تھی جب اس کی آنکھ کھلی۔

وِلا کے گول کمرے سے اس کے کنبے کی باتوں اور ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔ کسی وقت یہ لوگ واپس آ گئے تھے۔

ما نے دروازہ کھولا اور ورانڈے میں قدم رکھا۔

جیسے اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ جائے! اس کے چاروں طرف آتش بازی سی چھُوٹ رہی تھی۔ جہاں تک نظر دیکھ سکتی تھی، گہرے اودے اندھیرے میں، دور دور تک جگنوؤں کے جمگھٹ اڑ رہے تھے، ناچ رہے تھے۔ ان سے ایک غیرارضی قسم کی سبز روشنی پھُوٹ رہی تھی۔ دور دور تک پُھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ جگنوؤں کے دَل کے دَل! سینکڑوں، ہزاروں، سوئی کی نوک جیسی باریک، چمکتی روشنیاں، ہر طرف اڑتی ہوئی!

آنکھیں پھاڑے ما دیکھ رہی تھی۔ پہاڑ پر اتنے جگنو کہاں ہوتے ہیں؟ یہاں کے گرم مرطوب

موسم کی وجہ سے ہو گئے اتنے جگنو! اور ان کا یہ رنگ! یہ سبز کیوں؟ پتوں کا عکس کیا؟ یا پتّے کھا کھا کر ایسے ہو گئے؟ ما کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ مبہوت ہو کر اس منظر کا تحیّرخیز حسن دیکھ رہی تھی جس نے اسے پل بھر کو دنیاومافیہا سے غافل کر دیا۔ جب ہوش آیا تو تیزی سے پلٹ کر اس نے گول کمرے کی کھڑکی پہ ہاتھ مارا اور چلائی: "جگنو!"

دروازہ بھڑاک سے کھول کر سب لوگ باہر دوڑے آئے۔ پل بھر کو حیرت کی مورت بنے فطرت کے اس عجوبے کو دیکھا کیے۔ راتری نے جادو کی کوئی چھڑی چُھو کر پورے منظر کو کیا سے کیا بنا دیا تھا!

پھر وہ کلکاریاں مارتے، تالیاں بجاتے، احاطے کے میدان میں پھیل گئے، جیسے جگنوؤں کی بارش میں نہاتے ہوں۔ وہ دور دور تک جگنوؤں کے پیچھے دوڑنے لگے۔ جگنو ان کے بالوں میں الجھ رہے تھے، ان کے پھیلے ہوئے ہاتھوں اور بانہوں پر چپک رہے تھے۔ بچوں کے ہنگامے سے جامنوں کے خاموش، برگزیدہ، موٹے تنوں میں سوئے ہوئے لنگوروں کی نیند ٹوٹ گئی۔ لنگور ہڑبڑانے اور چڑچڑ کرنے لگے۔ لنگوروں سے ڈر کر بچے واپس دوڑے۔ اپنے کپڑوں اور بالوں میں جگنوؤں کی افشاں سی چُنے ہوئے۔

کوٹھری کے دروازے سے لگی اُشا جھانک رہی تھی۔ ہنس رہی تھی۔ "اندر جاؤ اندر--- لنگور کاٹ لے گا۔"

وہ سب جلدی سے گول کمرے میں گھس گئے۔ بجلی کی کمزور روشنی میں آتے ہی جگنوؤں کی چمک ناپید ہو گئی۔ اب تو وہ بس بھورے بھورے کیڑے تھے۔ سب سے زیادہ جگنو بڑکی کی بانہوں اور گردن پر چمٹے تھے۔ سب سے زیادہ اونچی چھلانگیں وہی لگا رہی تھی، لمبی بانہیں چاروں طرف لہراتی۔ اب جگنو اس کی قمیص میں گھُسے پھرپھرا رہے تھے۔

اوں! آ! اوہ۔ تھت تھت تھت---" بڑکی بلبلا کر گیند کی طرح اچھلنے اور اپنے بدن پر تابڑتوڑ ہاتھ مارنے لگی۔ ما نے اچھلتی لڑکی کو غور سے دیکھا: "یہ کیا حرکتیں کر رہی ہو؟"

ما نے بڑکی کو ڈانٹا۔ کون کہے گا یہ سولھویں میں لگی ہے! اس نے دل ہی دل میں متّھے پر ہاتھ مارا۔

"جاؤ باتھ روم میں جا کر کپڑے جھاڑو!" اس نے بڑکی کو حکم دیا اور خود ککلی اور چیکو کے کپڑے اتار کر جھاڑنے لے چلی۔ پھر اس نے آواز دی۔ "با!"

با ابھی تک ورانڈے میں کھڑا جگنوؤں کو دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ اُشا کی کوٹھری کو بھی دیکھ رہا تھا۔ ما کو یاد آیا۔ ارے ورانڈے کی بتّی۔ پرلی والی بتّی کہا تھا نا اُشا نے؟ کھڑکی سے جھانک کر اس نے اطمینان کر لیا۔ بتی کسی نے جلائی ہی نہیں تھی جو بجھائی جاتی۔

یوں ہی ڈبکی لگا لیتے ہیں۔ کچھ گھس تھوڑا ہی جاتا ہے۔ ما نے یاد کیا۔ ایک عورت کے منھ سے یہ بات سن کر اس کی اندر کی آتما ہنس دی تھی۔ اس جملے کی پھکّڑ ذومعنویت بھی ہی گئی تھی۔ اُشا کی روح نہیں ہے کیا؟ ما نے سوچا۔

روح اور بدن کی یکجائی کے چکر میں نہیں پڑتی کیا وہ؟ جس میں خود اس نے ساری عمر بِتا دی۔ یا گنوا دی؟ اس زمین کے پراچین کالوں کا کہیں پڑھا خیال اس کے دماغ میں گونجا۔ "شے میں جو کچھ نہ گھٹتا ہے، نہ بڑھتا ہے، نہ متغیّر ہوتا ہے، سدا پُرسکون اور شانت، وہ ذی روح ہے۔ جو کچھ بڑھتا ہے، پھلتا پھولتا ہے، جنم لیتا اور جنم دیتا ہے، وہ ذی روح نہیں۔ وہ سوچ نہیں سکتا۔" وہ دل میں ہنسی۔ مجھ میں مادہ نہیں ہے کیا؟ جو سوچ نہ سکے؟ بس یوں‌ہی، بِناسوچے، ماس کا لطف لے سکے، اور دے سکے؟ ہو گا تو ضرور--- اس نے سوچا، کہیں روح کے مساموں میں پھنسا ہوا۔ کوئی گہرا اداس اندھیرا اس کے اندر ابھرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تب ہی چیکو رویا۔ ما اپنی سوچوں کے سفر سے واپس لوٹ آئی۔

سہ پہر کی بےوقت نیند لے کر، اس کا دماغ الجھا الجھا سا تھا۔ اس دھندلکے میں اس نے اُشا کی بات ٹھیک سے سمجھنے کی دوبارہ کوشش کی۔ اسے اُشا کی پُرسکون، مسکراتی آنکھیں یاد آئیں۔ "مرد کی جات ایسی ہی ہوتی ہے۔" اور "تم فکر مت کرو۔" کیا مطلب تھا اس کا؟ ایک مطلب تو یہ ہو سکتا تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہو گا، تم فکر نہ کرو۔ اور دوسرا مطلب--- دوسرا مطلب یہ ہو سکتا تھا کہ مرد کی جات ایسی ہی ہوتی ہے، تم فکر مت کرو۔

اچھی خاصی سمجھ رکھنے والی ما، ان جملوں کو اگے پیچھے کر کر کے اُشا کی بات کا صحیح مفہوم سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر اسے اپنی حماقت پر زور کی ہنسی آئی۔ بچّے کپڑے پہنتے پہنتے ما کی طرف منہ اٹھا کر دیکھنے لگے۔ کیوں ہنس رہی ہے؟ اسے ہنستا دیکھ کر وہ بِنا کچھ سمجھے ہنسنے لگے۔ آپ ہی آپ۔ ما نے انہیں بھینچ بھینچ کر پیار کیا، دونوں کو ان کے کمرے میں جدا جدا بستروں پر لٹا دیا۔ ساتھ سونے سے لڑتے تھے دونوں۔ ایک دوسرے کا تکیہ گھسیٹ لیتے تھے۔

رات دیر گئے--- سب اپنے کمروں میں۔ برسوں پرانی بنی ولا میں بند کمروں کی مسکی خوشبو میں تیرتے، ڈھیلی پڑی اسپرنگوں والے گدوں پر، موہوم سی فنائل کی مہک والی رضائیوں میں، ایک دیوقامت ڈبل بیڈ پر ما، با کے ساتھ۔

خاموشی۔

"کہاں گئے تھے؟"

اس نے با کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

"بازار۔"

انھوں نے بتّی بجھا دی تھی۔ دو جگنو بچوں کےکپڑوں سے نکل کر بھٹک کر کھڑکی کی ککگر تک آ گئے تھے۔ دو سبز جگنو دیر تک جھلملاتے رہے۔ ما انہیں دیکھ رہی تھی۔ ما کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ دیر تک جاگی۔ دیر تک جگنو جھلملاتے ہوئے پورے کمرے میں گھومتے رہے۔

ooo

ایک دم اُجالا۔ جیسے سورج پہاڑ کے پیچھے چھپا، بےچین اور منتظر بیٹھا تھا اور چھلانگ مار کر نکل آیا تھا۔ رات ما کی نہ جانے کب آنکھ لگی تھی اور کب وہ پھر جاگ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے سوئی ہی نہ ہو۔ یا ابھی تک پڑا بےخبر سو رہاتھا۔ بچوں کے کمروں میں بھی خاموشی تھی۔ ما جلدی سے ساری لپیٹ کر کمرے سے باہر آ گئی۔

باہر خوب اُجالا پھیل چکا تھا۔ آشا ولا کے کچن میں کھٹرپٹر کر رہی تھی جہاں شہر سے لوٹ کر بڑکی اور با نے ساتھ لایا ہوا سارا سامان پھیلا دیا تھا۔ سبزیاں، پکانے کا تیل، مرچ مسالے، رسوئی کا سارا بکھیڑا۔ آشا انھیں سنگوا رہی تھی۔

"چلو نیچے چلتے ہیں،" ما اسے اصرار سے اپنے ساتھ نیچے لے چلی۔ "ان کے جاگنے سے پہلے لوٹ آئیں گے۔"

اب وہ لنگوروں سے اتنی گھبرا نہیں رہی تھی۔ جیسے سمجھ گئی ہو۔ انھیں نہ چھیڑو تو یہ کچھ نہیں کہیں گے۔ جامنوں کی شاخوں کا، تنوں کا سہارا لیتی، تقریباً پھسلتی، وہ آسانی سے، تیزی سے پہاڑی سے نیچے اتر آئیں۔ نیچے تو سب دنیا جاگ پڑی تھی۔ پہاڑی کی گھڑسواری کے قابل سڑکیں آباد ہو گئی تھیں۔ نیچے ہی بس کا اڈا تھا۔ ایک تھڑے سے ما اور آشا نے صبح کا پہلا پہلا چائے کا گرم پیالا پیا۔ چائے اتنی میٹھی تھی کہ ما کے ہونٹ چپک گئے۔ "بہت سستی ہے شکر یہاں،" آشا نے کہا۔ یہ گنّوں کا علاقہ تھا۔ ترائی میں میلوں تک گنّے کے فارم تھے۔ "میرے چھوٹے ہوتے تو" آشا نے کہا، "گڑ کی بھیلی بھی نہیں ملتی تھی۔"

ما نے کتنے ہی سیّاحوں سے دعاسلام کر لی۔ زیادہ تر چھوٹے اسٹیشنوں سے آئے تھے۔ اور کچھ بمبئی سے۔

ما کو تعجب بھری ہنسی آئی جب اسے لگا، الوتےدار بلوتےدار بھلے ہی فارسی کی کوئی بگڑی ہوئی ترکیب ہو، پھر بھی اس مراٹھی پہاڑی اسٹیشن پر ہر پوری عمر کے مرد کا نام سواجی ہی تھا۔ مراٹھی ماؤں کو دوسرا کوئی نام نہیں سوجھتا!

ٹنکی والا سواجی، گھوڑوں والا سواجی، اور چائے کی دوکان والا سواجی، حالانکہ گھنے جنگلوں میں گھسی اس پہاڑی پر سواجی مرہٹے کے گھوڑوں کے سُم نہ پڑے ہوں گے۔ ڈیڑھ سو برس پہلے تک یہاں سورن ہندو تہذیب بھی نہ پہنچی تھی۔ جو کچھ لوگوں سے باتیں کر کے اس کے پلّے پڑا تھا، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ پہلے یہاں آدی واسی رہتے تھے، ہندوستان کے قدیم انسان جنھیں مار بھگا کر انگریزوں اور شہری لوگوں نے سو ڈیڑھ سو برس پہلے یہ تفریحی مقام آباد کر لیا تھا۔

جب وہ پہاڑ پر ملنے والے اصلی مرغی کے اصلی انڈوں کا اور توے پر سکی ڈبل روٹی کا اور امل دودھ کا ناشتہ کر چکے تھے تب ما کو پتا چلا۔ جو کچھ نہ ہونا تھا سب ہو چکا تھا۔ (ما کو پہلے ہی پتا تھا۔)

چیکو کو زکام تو نہیں ہوا تھا مگر اس کی ران پر کسی کیڑے نے کاٹ کھایا تھا۔ کاٹے کا

نشان سرخ سرخ ددوڑا بن کر پھیلتا جا رہا تھا۔ کسی زہریلے کیڑے کے خیال سے ما کا دل سہم گیا۔ ہائے میری ماں! اب یہاں ڈاکٹر کہاں ہو گا!

با بھی سہم گیا۔ "ہے ڈاکٹر۔ اسٹیشن کے پاس۔ ڈاک خانے کے پیچھے۔ فزیشن کی ڈسپنسری ہے۔" با منہ ہاتھ دھوئے بنا، چیکو کو کندھے پر لاد کر، ڈھلان پر جما جما کر قدم دھرتا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا، دو پہاڑیاں پار بازار کی سمت چل دیا۔ سمجھ دار چیکو نے دونوں بانہیں با کی گردن میں ڈال کر مضبوط حلقہ بنا لیا تھا اور اپنا سر با کی گردن اور شانے کے خم میں مضبوطی سے جما دیا تھا۔ جامن کی ٹہنیوں پر لنگور چڑچڑائے اور سرعت سے ایک شاخ سے دوسری شاخ پر منتقل ہونے لگے۔

بڑکی کی نظر لڑکے پر پڑ گئی تھی۔ منہ سے ڈبل روٹی کے ذرے جھاڑ کر، خوشی سے بےقابو ہوتے ہوئے، ہنستی چمک دار آنکھیں میچ کر، اس نے ما کی گود میں سر رکھ دیا۔

"رمیش نام ہے اس کا۔۔۔ رمیش سنگھ۔ ما، اس قدر اسمیشنگ ہے کہ کیا بتاؤں! بی کام میں پڑھ رہا ہے۔ انگریزی ذرا کمزور ہے۔ اپنے ڈیڈی کے ساتھ آیا ہے۔ اور تیسری پہاڑی پر ہوٹل میں ٹھہرا ہے۔ رائیڈنگ کرتا ہے۔ گھوڑا اپنا ہے۔ اس کا اپنا۔ وہ ہر سال یہاں آتے ہیں اس لیے گھوڑا خرید لیا۔" اس نے چٹکی بجائی۔

"کہاں مل گیا تجھے؟" ما نے اترے منہ سے پوچھا۔

"میں نے تو کل ہی دیکھ لیا تھا،" بڑکی نے جھٹ سے کہا۔ اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔ رومانی لہجے کے بجائے وہ بالکل سمجھ داری سے مستعد اور ہنرمند لڑکی کی طرح باتیں کرنے لگی۔ "وہی جو سفید گھوڑے پر تھا۔ آپ نے نہیں دیکھا تھا؟ بس کی کھڑکی سے؟"

ما نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ ما کو کچھ نظر ہی کہاں آتا تھا! مسکراہٹ ضبط کرتی، وہ بڑکی کو تکتی رہی جو اس کی گود میں پڑی تھی۔

"با کی نظریں بچا کر تُو نے اتنی ساری باتیں اس لڑکے سے کیوں‌کر کر لیں؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"گوشت کی دکان میں گئے تھے با،" بڑکی کی بتیسی پھر باہر آ گئی۔ اس نے پھر آنکھیں میچ لیں اور شدید رومانی ہو گئی۔ کچھ روتی اور کچھ ہنستی ما نے بڑکی کا سر سہلایا۔ "تو پھر؟"

"پھر کیا؟" بڑکی جھٹ پٹ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بولی "تو ہینکی پینکی!"

"وعدہ؟" ما نے کہا۔

"ہنڈریڈ پرسنٹ،" بڑکی نے فوراً ما کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھانی شروع کر دیں۔

"دیکھ بڑکی!" ما نے کہا۔ "اگر تم رائیڈنگ پر جاتے ہو اور یہ رمیش لڑکا بھی جاتا ہے تو کوئی بات نہیں۔ تم سب، یعنی چیکو، ککلی، اور تم، اور با!"

بڑکی کا منہ اتر گیا۔ مگر وہ کچھ بولی نہیں۔

"اور تُو اپنی کتابیں تو لائی ہے نا؟ زولوجی؟ اور میتھس؟ جن میں زیرو انڈا ملا ہے؟ روز دو گھنٹے ضرور پڑھنا ہے۔"

"لائی ہوں،" بڑکی نے بالکل مری ہوئی آواز میں کہا۔ پھر وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ٹہلنے لگی۔

"رمیش کی انگریزی۔۔۔ کمزور ہے اس کی انگریزی۔ میں اسے پڑھا نہ دیا کروں؟ ہر روز دو گھنٹے؟" اس نے بہت فکرمند منھ بنا کر پوچھا۔

"نہیں!" قطعیت سے ما نے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر بڑکی کی آنکھوں کے نیچے، انگلیاں نچا کر کہا:

"یہ دیکھتی ہے یہ کیا ہے؟ میرے ناخون، کیا ہے ان میں؟"

"کیا ہے؟" بڑکی نے آنکھیں پھاڑیں۔ وہ بور ہو گئی تھی۔

"تیری چالیں! میرے ناخنوں میں ہیں یہ چالبازیاں تیری۔ دو گھنٹے تک تم خود پڑھو گی۔ کیا سمجھیں؟" اس نے مصنوعی غصّے سے بڑکی کو ڈانٹا۔ بڑکی سہم گئی۔

ککلی نہ جانے کب وہاں آ گئی تھی۔ اسے نہ آنا چاہیے تھا، مگر آ گئی تھی۔ اس نے ما کا آخری جملہ سن لیا تھا۔ وہ ما کے پیچھے چپ چاپ چلتی آئی اور اپنے حصّے میں آئی الماری ٹٹولنے لگی۔

ما کرسی پر بیٹھی انگلیاں چٹخاتی رہی۔

با ابھی تک نہیں آیا۔ چیکو کی دوا ملی کہ نہیں! بڑکی کو پڑھائی کے لیے وہ یوں‌ہی یاد نہ دلاتی تھی۔ چھٹیوں کے فوراً بعد امتحان ہیں۔ اس تندرست لڑکی کو جیسے کسی وہیل چیئر پر بٹھا کر، دھکا لگا کر دسویں سے نکالنا تھا۔ با کو اُشا کے ساتھ متّھا مارنے سے کسی نہ کسی طرح روکنا تھا۔ پھر اس کی نظر ککلی پر پڑی۔

سانولی ننّھی شیدیانی، پوری سنجیدگی سے، اپنے چھوٹے سے وجود کی ساری توجّہ مجتمع کیے کاپی پر جھکی ہوم ورک کر رہی تھی۔

خوشی اور تشکر سے ما کی آنکھ میں پانی آ گیا۔ "ککلی! تُو ہی تو ہے نا ایک، مجھے کبھی نہ ستانے والی!" ککلی کی توجہ نہ توڑنے کی خاطر ما نے دل ہی دل میں اسے پیار کیا۔

منگل کے دن (ما کو پتا چلا) پہاڑ کے کھلے، آسمان تلے پھیلے بازار میں ترائی سے آنے والے دیہاتوں کا میلا لگتا تھا۔ زمین پر کپڑا بچھا کر انھوں نے اپنے منکوں کے ہار اور کنگھیاں، کھڈّی پر بنے کمبل، لاکھ کے بنے ٹکلیوں‌دار زیور، جن پر چاندی اور دوسری دھاتوں کی پتریاں چڑھائی گئی تھیں، اور چھوٹے بڑے دیوی دیوتاؤں کی، لکڑی، پتّھر اور مٹی کی مورتیاں سجا رکھی تھیں۔ ڈھلانوں سے اترتی اور پہاڑی کے پیچ و خم کے ساتھ گھومتی ان گنت زمینی دوکانیں، جو جیسے کسی جادو سے موجود ہو گئی تھیں اور کسی جادو سے جنھیں دوسرے دن غائب ہو جانا تھا۔ بھاکری دال موٹھ کے خوانچے، چائے کے ٹھیلے۔ دکان دار چوڑے پلس کے پتّوں کا پُھرتی سے دونا بناتا اور چائے بھر بھر کر بانٹتا جاتا۔ پتّوں کے دونے سے (جس میں پن کی طرح کانٹا چبھو دیتا تھا) ایک قطرہ چائے بھی تو زمین پر نہ گرتی تھی! ککلی اور بڑکی خوشی سے اچھلیں۔ انھوں نے

پتے موڑ موڑ کر دونے بنانے کی مشق شروع کر دی۔

با میلے میں کہیں ادھر اُدھر ہو گیا تھا۔ ہر چیز خریدنے پر آمادہ، وہ کئی طرح کے ننھے منے راکھ دان جمع کر رہا تھا۔ چیزیں جمع کر کے وہ ان کے پاس تنکوں کی ٹوکری میں رکھوا جاتا۔

ما نے ترائی سے نمودار ہونے والے دکان داروں کو غور سے دیکھا۔ ان دیہاتیوں کے چہرے اسے عام مراٹھوں سے کچھ مختلف لگے۔ ان کے رخساروں کی ہڈیاں خفیف سی ابھری ہوئی تھیں اور جلد کا رنگ مراٹھوں کی طرح گہرا سانولا نہیں، گندم گوں تھا۔ وہ گاہکوں سے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بات کر رہے تھے۔ کوئی کوئی تو انگریزی کے ایک دو لفظ بھی بول دیتا۔ یہ دلّی میں جن پتھ پر بھیڑ لگانے والے نیپالیوں کی طرح راک موسیقی کے گائیکوں جیسے ماڈرن تو نہیں تھے، لیکن شہریوں سے بات چیت کرنے میں کافی منجھے ہوئے لگ رہے تھے۔

"تم ہندی جانتے ہو؟" ما نے ایک نوجوان سے پوچھا جس نے پھول دار بش شرٹ اور ایک پھٹی پرانی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے تیل لگے بالوں کے پٹّھے کانوں سے نیچے تک آ رہے تھے۔

دکان دار مسکرایا۔ "تھوڑی تھوڑی۔"

"مراٹھی بولتے ہو؟"

"نہیں--- تھوڑی تھوڑی۔" دکان دار نے کہا۔ وہ اسے منکوں کے ہار دکھانے لگا۔ "پانچ روپے بائی۔ پانچ۔" اس نے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں پھیلا کر دکھائیں۔

"مراٹھی نہیں جانتے تم؟" ما نے شوق سے پوچھا۔ وہ ان کی مورتیاں دیکھنے لگی۔ اپنے پہچانے دیوی دیوتا کھوجنے لگی: شیر پر سوار دُرگا، مورپنکھ بالوں میں سجائے کرشن، گلے میں سانپ لپیٹے شوجی، یا رام، جن کے ساتھ یہ سب کچھ نہ ہوتا تھا اور جو بس ایک کنول پر کھڑے رہتے تھے اور جو اُتر کی طرف عام تھے، گنگا جمنا کے علاقوں میں۔ لیکن ان مورتیوں میں اسے ایک بھی آشنا مورتی نہ نظر آئی۔ یہ تو کچھ اور ہی قسم کی تھیں۔

"یہ مورتیاں کن دیوتاؤں کی ہیں؟" اس نے پوچھا۔ پھر اسے کرید ہوئی۔ "تم رام اور سیتا دیوی کو مانتے ہو؟"

"نہیں،" نوجوان نے اختصار سے کہا۔ وہ دوبارہ اس کے ہاتھ منکوں کا ہار بیچنے کی کوشش کرنے لگا۔ "یہ دیکھو--- ایک دم چمکیلا ہار۔ یہ پہنے گا ناک میں۔" اس نے ما کو ایک بڑا سا نکیل نما حلقہ دکھایا جس میں ستارے ٹکے تھے۔

ما حیرت اور اشتیاق سے اپنی دریافت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے انگریزی میں با سے کہا جو ان کی ٹوکری میں کچھ رکھنے ابھی ابھی آ نکلا تھا:

"یہ لوگ مراٹھا نہیں ہیں--- اور حقیقت میں ہندو بھی نہیں ہیں۔ یعنی کہ جیسا ہم انہیں جانتے ہیں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں میڈم آپ؟" اس کے پیچھے سے آواز آئی۔ ما نے چونک کر پلٹ کے دیکھا۔ ان کے پیچھے انہی کی طرح پہاڑ گھومنے آئے دو مراٹھا لڑکے کھڑے تھے۔ طالب علم معلوم ہو رہے تھے، اور کافی گھبراہٹ اور غصّے سے اس سے مخاطب تھے۔ ان میں سے ایک اس سے

الجھنے پر اتارُو تھا۔

"یہ لوگ بالکل مراٹھا ہیں۔ ہنڈریڈ پرسنٹ! اس طرح تو آپ ہمیں مہاراشٹر ہی میں اقلیت میں تبدیل کر دیں گی۔ ایک تو ویسے ہی پورے انڈیا کے گنڈوں اور بےروجگاروں نے مہاراشٹر پر دھاوا بول رکھا ہے۔ ایک تو ویسے ہی بلا بول رکھا ہے گجراتیوں نے--- گجّو بھائیوں نے---"

وہ تو اور جانے کیا کچھ کہتا، لیکن اس کا ساتھی اسے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا دوسری طرف لے گیا۔

ما حیران پریشان کھڑی رہ گئی۔ جیسے کسی نے گھنٹی بجا کر اس کے سامنے ہندوستان کے نقشے کو چکر کی طرح گھما دیا ہو۔ "اوہو! تو یہاں بھی وہی مسئلہ ہے!" ابھی ابھی جو اس نے سنا یہ ایک سنی ہوئی بات تھی۔ کسی اور پردیش میں--- کسی اور ملک میں--- کسی اور سرزمین پر---

"یہ آدی واسی ہیں،" ما نے آہستہ سے کہا۔

مگر ایسے نہیں جیسے فلموں میں نظر آتے ہیں۔ یہ تو اچھے خاصے--- ماڈرن ہندوستانی ہیں۔ ما نے اپنےآپ سے کہا۔

اس نے اُشا کی کھنکھناتی ہنسی سنی جو بالکل اس کے پاس کھڑی تھی۔ ایک عجیب موسیقی جیسی، مدّھم، ننھی منی گھنٹیوں کی طرح بجتی ہوئی ہنسی۔

"تو میں کون ہوں؟" اشا ہنستی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"تم؟"

"ورلی ہیں یہ بائی۔ ادھر نیچے رہتے ہیں۔ جنگلوں میں۔ مومبائی کے پاس، دابانو، پال گڑھ تعلقے میں۔ اور امبر گاؤں میں--- جہاں میرا گاؤں ہے۔"

"تم--- آدی واسی ہو؟" ما نے چکرا کر پوچھا۔ اچانک اسے اُشا اور ترائی سے آئے ہوئے ان دیہاتیوں کے نقوش میں مشابہت کا احساس ہوا۔ وہی پُرسکون خط و خال--- اور گندمی رنگ۔

"ورلی۔ ہماری کوت ورلی ہے۔ وہیں رہتا ہے میرا باپ۔ مہینے میں ایک بار آتا ہے۔ اب کی منگل وار کو آئے گا شاید۔ آپ ملو گی؟"

سامان کی ٹوکریاں اٹھائے دونوں عورتیں آہستہ آہستہ ریل کی پٹریوں کے ساتھ ساتھ ولا کی طرف واپس آنے لگیں۔ پیچھے پیچھے با ایک لمبی چھڑی سے چیکو، ککلی اور بڑکی کو تقریباً ہانکتا ہوا آ رہا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک اکتا دینے والی سیر تھی۔ کسی بھی بہانے وہ اُشا کو گھر پر کھانا تیار کرنے اور خود آرام کرنے، اور ما کو بچوں کے ساتھ بازار بھیجنے کی ترکیب پر عمل درآمد نہ کر سکا تھا۔

"تو یہ تھے آدی واسی!" ما نے تعجب کی سنسنی میں ڈوب کر سوچا۔ کہاں تھے یہ لوگ

ہزاروں برسوں سے؟ کیا بس یوں ہی---؟ سب سے کٹے ہوے رہتے ہوں گے؟ جب ان علاقوں میں سواجی مرہٹے کے گھڑسواروں کی دھمک سے پہاڑ گونج رہے تھے؛ جب تاریخ کے منچ پر اورنگ زیب کی افواج اور مرائھوں کی جھڑپوں کا خونیں مگر پُرشکوہ ڈراما کھیلا جا رہا تھا، تب--- یہ کہاں ہوں گے؟ جنگلوں میں؟ گھنے جنگلوں میں چھپے جھانک رہے تھے؟ جھانک کر دیکھ رہے تھے ہزاروں برس سے۔ یہ انسانی تاریخ کے سب سے زیادہ غیرجانبدار انسان۔ سوئٹزرلینڈ سے بھی زیادہ! ما نے فیصلہ کیا۔ جنگلوں میں ہزار برسوں سے چھپے، لاکھوں لوگ! اس نے پھر سنسنا کر سوچا۔ جنگلوں میں رہنے کی وجہ سے ان کا رنگ سنولایا نہیں۔ دھوپ نہیں آتی ہو گی نا وہاں، اس نے سوچا۔

"کہا جاسکتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے۔"

بمبئی میں سنچری بازار کے پاس، پارٹی آفس میں کامریڈ رانگانیکر نے ہنستے ہوے سرہلایا۔ (ما کی یہ بات سن کر کہ ورلی آدی واسی نہ مرائھا تھے اور نہ ہندو۔)

"مگر اب لگتا ہے، تہذیب کا تیزی سے گھومتا چکر انھیں جھوڑے گا نہیں۔ وہ انھیں اپنی لپیٹ میں لے کر ہی دم لے گا۔ اور یہ--- آدی واسی--- جسے ہیں اور جہاں ہیں، وہیں کی تہذیب میں رُل گھُل کر، اسی کا ایک انگ بن جائیں گے۔ پچاس برس بعد، اسّی پچاسی برس بعد۔ آپ کو بالکل ویسے ہی ایک ورلی مرائھا مل سکتا ہے، جیسے آج ایک رانگانیکر مرائھا مل رہا ہے۔"

"مگر یہ صرف مہاراشٹر ہی میں تو نہیں---" ما نے کہا۔

"نہیں نہیں! ایک چوڑی پٹی ہے پہاڑوں کی۔ اور بنوں کی---" کامریڈ رانگانیکر کرسی سے اٹھ کر شیلف میں لگی کتابیں الٹنے پلٹنے لگے۔ "یہ دیکھیے!" انھوں نے ایک کتاب کھول کر اسے سبز اور خاکی رنگوں سے بنائے ہوے نقشے دکھائے۔

"یہ تو ایک چوڑی پٹی میں پورے ہندوستان کو لپیٹے ہوے ہیں۔ یہ دیکھیے۔ عرب ساگر کے پاس سے، سورت، کھنڈیش، میل گھاٹ، چندا، بستر، سریکاکلم، کوراپٹ، چھوٹا ناگپور، سنتھال پرگنہ سے لے کر ہمالیہ کی ترائیوں اور اروناچل تک پھیلے ہوے ہیں۔ یہیں یہ پہاڑوں اور ان کے سنگ اگنے والے بہت گھنے بنوں میں رہتے ہیں۔"

"چھوٹا ناگپور!" ما کی یاد میں گھنٹی سی بجی۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو اخبار میں ایک عجیب خبر دیکھی تھی۔ چھوٹا ناگپور کے ٹرائبلز نے حکومت انگلشیہ کو درخواست بھیجی ہے کہ انھیں ایک الگ ملک قرار دے دیا جائے۔ وہ پیٹ دبا کر ہنستی رہی تھی۔ "یہ ہے ہندوستان! یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہی۔ مدھیہ پردیش کی نابھی میں جما چھوٹا ناگپور (بڑا بھی نہیں!) بقیہ ہندوستان سے علیحدگی کا--- لیکن---" اس پر دوبارہ ہنسی کا دورہ پڑا تھا۔ "یہ درخواست--- اب--- انگریزی سرکار کو کیوں بھیجی گئی؟ ان کے جانے کی خبر جنگلوں میں دیر

سے پہنچی کیا؟ یا پہنچی ہی نہیں؟"

اس خبر کو سب نے ہنسی میں اڑا دیا تھا۔ لیکن اس وقت وہ ایک پیچیدہ صورت حال کو نئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ چھوٹا ناگپور تو جہاں بھی ہو۔۔۔ لیکن وہ خود۔۔۔ کیا انجانے میں انسانی وجود کی نابھی سے جا ٹکرائی تھی؟

000

آخر با نے ایک ترکیب سوچ لی۔ ایک پیچ دار ترکیب۔ بدھ وار کی صبح وہ ما کو بازار لے جائے گا۔ اس کے بعد، جب کہ اُشا کھانا پکا چکی ہو گی، وہ ما کو واپس لے آئے گا۔ پھر ما بچوں کو سیر کرانے لے جائے گی۔ اور با؟ وہ تھوڑی دیر سوئے گا۔

ما با کے ساتھ بازار گئی، پروگرام کے مطابق واپس آئی، اور پھر بہت تھک گئی۔ با جب چادر اوڑھ کر بستر پر لیٹا تو ما کو وہاں پا کر ششدر رہ گیا۔

"بچے شور مچائیں گے۔ ضد کریں گے بچے۔" اس نے ما کو سہولت سے سمجھایا۔ "تم انہیں سیر کرانے لے جاؤ۔"

"وہ تو دیر ہوئی اُشا کے ساتھ جا چکے ہیں۔" ما نے اسے اطلاع دی۔

با بستر پر اچھل پڑا۔ اس کا پورا بدن اکڑ گیا۔ وہ فوراً بستر سے اتر کر موزے جوتے پہننا چاہتا تھا۔

"اُشا اکیلی۔۔۔ وہ ککلی کو۔۔۔ چیکو کو۔۔۔ کیسے سنبھالے گی اُشا انہیں؟" اس نے سرعت سے کہا۔ اب وہ بستر پر بیٹھ چکا تھا۔

ما آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ وہ واقعی تھک گئی تھی۔

آنکھیں بند کیے کیے اس نے آدمی کو بستر سے نکلتے، ادھر اُدھر کھڑبڑ کرتے سنا۔

"کہاں؟ کس طرف گئی ہے؟ کس طرف گئے ہیں سب لوگ؟" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"آخری پہاڑی پر۔ جہاں دوربین لگی ہے۔" ما کی اداس آواز آئی۔

افوہ! اتنی دور؟ گریں گے سب لوگ! اکیلے۔۔۔" با نے افسوس سے کہا اور چشم زدن میں کمرے سے باہر دوڑ پڑا، اپنے اوپر مردانہ آفٹرشیو کی پھوہاریں ڈالتا۔ کمرہ خوشگوار مہک میں بس گیا۔

بچے اُشا کے ساتھ آخری پہاڑی پر نہیں گئے تھے۔ اتنی دور تک وہ واقعی انہیں کیسے سنبھالتی! وہ تو بڑی مال تک گئے تھے۔

با کو دھوکا دے کر ما آرام سے سو گئی۔

اندھیرا پڑتے ہوئے جب با، آخری پہاڑی سے اکیلا منہ مار کر، سنگلاخ سرخ چٹانوں میں اُشا اُشا پکار کر، اور ان کی گونج کو دور دور تک تالیاں بجاتے سن کر، اور بےبسی میں دو

روپے دے کر دوربین سے دور نظر آنے والے بنوں کو دیکھ کر واپس لوٹا، سرخ مٹی میں آٹا ہوا، تب اُشا کب کی واپس آ چکی تھی اور اپنی کوٹھری میں آٹا گوندھ رہی تھی۔ بڑکی اور ککلی اس کے پاس زمین پر بیٹھی، ڈھیر سے جمع کیے ہوئے چوڑے پلس کے پتوں اور کانٹوں سے لپاجھپ دونے بنا رہی تھیں۔ چیکو گندھے آٹے سے ہاتھی گھوڑے بنا رہا تھا۔

ما کے بازوؤں میں پا بےدم ہو کر گر پڑا۔

"ہو سکتا ہے ہندوستان کا قدیم انسان یونان اور برما سے آیا ہو۔ ان دونوں خطوں میں قبل از تاریخ پتھروں کے اوزاروں کی ساخت اور وہ مادہ جس سے یہ اوزار بنائے گئے ہیں، یکساں پایا گیا ہے۔"

ما کوسمبی کی کتاب کے ورق پلٹتی رہی۔ یہ پا کی کتاب تھی۔ پہاڑ پر مطالعے کے لیے وہ اسے دلّی سے ڈھو کر لایا تھا۔

"یہ خوراک بینتے تھے۔ کاشت نہیں کرتے تھے۔ گھنے جنگلوں میں آج بھی، خودرو باجرہ، جوار، گیہوں، چاول اور گرم مسالا تک مل سکتا ہے۔ تاریخ نویسوں کو یہ بات حیرت زدہ کر دیتی ہے کہ، جب کہ ان کے بالکل پڑوس میں کاشت کاری شروع ہو چکی تھی، کیوں‌کر ان میں سے اتنے زیادہ تعداد میں صرف خوراک بینتے پر قانع رہے۔ ان کا پیداوار کا طریقہ نہ بدلا۔ اسی طرح ان کی زندگی کا اور عقائد کا محور جوں کا توں رہا۔"

آگے لکھا تھا:

"ہندوستان کی پریشان کن خاصیت، متصل خطوں میں ادوار کا ایک دوسرے پر تہہ در تہہ حاوی ہوتا ہے۔ ایک دور شروع ہو کر اختتام پذیر ہو جاتا تھا، جب کہ پہلا دور پھر بھی باقی رہتا تھا۔ جنوبی علاقوں میں ان آدی واسیوں کے بنائے ہوئے دو عجوبے ملتے ہیں۔ یہ پتھروں پر ایک دائرہ سا کھود دیتے تھے۔ اس کے علاوہ چٹانوں پر دوسری چٹانیں رکھ دیتے تھے۔ مہاراشٹرمیں یہ اوپرتلے رکھی چٹانیں ہزاروں کی تعداد میں ملی ہیں۔ ان کا مطلب کیا ہے؟ یہ آج تک کوئی نہیں جان سکا۔

"خوراک بیننے والوں کی ایک دیوی ماں تھی۔ بعد میں گوالوں کا دیوتا دریافت ہوا ہے۔ ابتدا میں دیوی ماں کی دیوتا سے جنگ تھی۔ جب ان قبیلوں میں صلح ہوئی تو دونوں کی شادی کر دی گئی۔ پھر بھی ہمیں ان مندروں میں کہیں کہیں دیوی ماتا کاشت کاروں کے دیوتا مہاسوبھا کا سر کچلتے ہوئے ملتی ہے۔ جب کہ ایک کوس کے فاصلے پر کسی مندر میں دیوی مہاسوبھا سے سیاہ رچا رہی ہو گی۔

"بعد کے آنے والے براہمنوں نے اس جوڑے کو دراوڑی جوڑے شو اور پاربتی کی ابتدا قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر دراوڑی پاربتی شو کا اس طرح سر نہیں کچلتی۔ ادی واسی ابتدا میں اپنے مُردوں کو دفن کرتے تھے۔ دراوڑ صرف جلاتے تھے۔ اب جلانے کی رسم ادی واسیوں میں رائج ہو گئی ہے۔ ادی واسی کاشت کاروں میں کاشت کاری کا کام عورتیں کرتی تھیں۔ دراوڑ

کلچر میں زمین کھودنے کا کام عورتوں سے نہیں کروایا جاتا۔ یہ لوگ مٹی کے بالکل مدوّر، گول برتن، کمہار کے چاک کے بغیر، صرف ہاتھوں سے بناتے تھے۔۔۔"

تھے کیا مطلب؟ اب بھی بناتے ہیں، ما نے سوچا۔ اسے منگل وار کے میلے میں کپڑا بچھائے، مٹی کے برتن بیچتی عورت یاد آئی۔ سب کے سامنے چکنی سرخ مٹی کے لوندے کو ہاتھوں سے تھاپ تھاپ کر گول کر رہی تھی۔ اس کے گرد سیّاحوں کی بھیڑ تھی۔ پندرہ منٹ میں چھوٹے سے منھ اور بڑے سے پیٹ کی ہانڈی تیار ہو جاتی۔ فاتحانہ انداز میں وہ سب کو دکھا کر سوکھنے کے لیے قطار میں رکھ دیتی۔ عورت پر جھکا ہوا مجمع تعریف میں تالیاں بجاتا۔ ان میں سے زیادہ تر تو (بعد میں ما نے بتایا جو یہ تماشا دیکھنے والوں میں شامل تھا) عورت کی نیم عریاں چھاتیوں کے گول، گندمی پیالے دیکھ رہے تھے جو "ایشور نے اتنی، کیا کہتے ہیں کہ، کاری گری سے بنائے تھے۔" دیکھنے والوں میں سے ایک نے رقّت سے آہ بھر کر کہا تھا، اور انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا تھا۔

ہندوستان کی اَن لکھی، آدی تاریخ۔۔۔ ما نے سوچا۔۔۔ کتابوں کے بدلے ہر جگہ موجود ہے۔ اور کوئی دُور بھی۔۔۔ اس نے حیرت کی کہ۔۔۔ ختم نہیں ہوا۔

000

بدھ وار کی صبح، ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے۔ آشا نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

"باپ آیا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ چلی گئی۔

ما بال جھاڑتی اس کے پیچھے پیچھے آئی۔ وہ اس کوٹھری میں بہت ہی کم آتی تھی، جہاں اگر بتیوں اور تمباکو کی عجب ملی جلی خوشبو بسی رہتی تھی اور جہاں سہ پہر کی روشنی میں ایک دن اس نے دیوار پر عجیب نقش و نگار دیکھے تھے۔ آشا نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ کچھ جھجھک کر اس نے پٹ کھولے۔ یہ کوٹھری کچھ ایسے زاویے سے بنی تھی کہ دوپہر تک باہر احاطے میں دور دور پھیلا ہوا اجالا، جس میں سب کچھ صاف نظر آتا تھا، کوٹھری کے اندر براجمان اندھیرے کا بال بھی بانکا نہیں کر سکتا تھا۔ آشا کی کوٹھری کی نیم تاریکی میں اسے ایک بیولا سا نظر آیا۔

"اری مجھے کچھ نہیں دکھ رہا۔" ما نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بےاختیار کہا۔ اسے ڈر تھا زمین پر دھرے برتن بھانڈوں سے ٹھوکر نہ کھائے۔

آشا نے اپنی کوٹھری کی بائیں دیوار میں جڑی کھڑکی کھول دی۔ اس کھڑکی کا اسے پہلے کیوں پتا نہ چل سکا؟ شاید دیوار کے رنگ کی رنگی ہوئی تھی۔ کھڑکی کھلنے کے ساتھ ہی روشنی کی ایک چوڑس، چوڑی ترچھی لکیر کوٹھری میں گھس آئی۔ پل بھر تک تو ما اس زرد روشنی

ہی کو دیکھ سکی جس نے اچانک فضا میں معلّق ان گنت نہ جانے کس قسم کی دھول کے خوردبینی ذرّات روشن کر کے اسے سُجھا دیے۔ شاید اُشا نے ابھی جھاڑو دی ہو، ما نے سوچا۔ لیکن اب کمرہ روشن ہو چکا تھا۔

ایک ہاتھ سے اپنی مچمچاتی آنکھوں کو روشنی سے بچاتا ایک بہت بوڑھا، جھرّیوں کی پوٹلی سا آدمی ایک لمبی لاٹھی کے سہارے کھڑا ہو رہا تھا۔ اس کے تن پر ایک کسی ہوئی لنگوٹی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ہاں ہاتھ کے کتے اُون کی ایک رنگ برنگی کملی اس کے برہنہ شانوں سے ڈھلک رہی تھی۔

ما اسے نہایت حیرت اور اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے مٹھی بھر بال، جن میں اب بھی، جیسے کسی حیاتی معجزے سے کافی سیاہ بال موجود تھے، سکھوں کی طرح لمبے، جن کا اس نے تالو پر جوڑا بنا رکھا تھا۔ لیکن داڑھی مونچھ نہیں تھی۔

لاٹھی اُشا کو تھما کر، بڈھے نے سینے کے ساتھ ایک ہاتھ کا پیالا بنایا اور دوسرے بازو کی کہنی پیالے میں ٹکا کر بائیں اپنی ناک کے سامنے لکڑی کی طرح سیدھی کر لی۔

ما کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اسے شدید سنسنی محسوس ہوئی۔ وہ ایک سچ مچ کے آدی واسی کو دیکھ رہی تھی جو شاید اسے سلام کر رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک بےبس قسم کی ہنسی کو اپنے اندر کروٹیں لیتی محسوس کیے بنا نہ رہ سکی جو اس عجیب سلام سے پیدا ہو رہی تھی۔ جو اس کے اپنے تمام تر ثقافتی تجربے میں کسی فحش اشارے سے مشابہ تھا۔

"بیٹھو بیٹھو!" ما نے کہا۔

ہاں ہاں کرتا بڈھا بیٹھ گیا۔

ما نے حیرت سے پوچھا: "یہ ترائی سے، امبر گاؤں سے، اتنی اوپر پہاڑ پر چڑھ کر کیسے آ گیا؟"

"نہیں!" اُشا ہنسی۔ "بس میں آیا ہے۔"

ما اُشا کے پاس بیٹھ گئی۔

"کیا کرتا ہے تمہارا باپ؟"

"اب کیا کرے گا؟ بڈھا اتنا ہو گیا ہے۔ ہاں پہلے--- پہلے جنگل جلاتا تھا۔"

"جنگل؟"

اُشا ہنسی۔ "کوئلہ! کوئلہ جانتی ہے نا آپ؟ جو انگیٹھی میں جلتا ہے۔ پیڑ پورا جلا کر کوئلہ بناتا تھا۔"

"اچھا۔" ما نے کہا۔ وہ جانتی تھی (اسے یاد آیا۔ کوئلہ وغیرہ تو کب کا استعمال کرنا چھوڑ چکے تھے شہروں کے لوگ۔ کم از کم جن شہروں میں وہ رہی۔ پچیس تیس برسوں سے۔ کراچی اور دلّی۔ دلّی تک میں، جہاں قدرتی گیس نہیں تھی، وہ گیس کے سلنڈر استعمال کرتے تھے) کہ کوئلے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ پتھر کا کوئلہ اور لکڑی کا کوئلہ۔ مگر یہ بنتا کیسے ہو گا؟ اس بات کے سوچنے پر اس نے اپنے جیون کے پندرہ منٹ بھی کبھی نہیں گزارے تھے۔ ایسا اس نے صرف کبھی بچپن میں نصاب کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ زندگی کیا اس قدر زیادہ لمبی تھی؟ اس

ایک پل میں اس نے سوچا تھا۔ کچھ باتیں، پڑھی ہوئی، سنی ہوئی، کیا مٹی کے کسی تودے کے نیچے دفن ہو گئی تھیں؟ لیکن اس کے باوجود... کس قدر چھوٹی محسوس ہوتی تھی زندگی! جیسے کل ہی کی بات ہو... سب کچھ!

"ہاں..." اشا کہہ رہی تھی۔ "کوئلہ بنانا یہاں بس ورلیوں ہی کو آتا تھا۔ اب تو نہیں بناتے یہاں۔ سرکار نے منع کر دیا ہے۔ لیکن میرے چھوٹے ہوتے تک، ہم پیڑ کاٹتے تھے۔ ہر رات الاؤ جلتا تھا۔ بہت بڑا الاؤ! اس میں پورا پیڑ پھینکتے تھے... ایک بار... ایک بار تو ایک آدمی کو پھینک دیا تھا۔"

"آدمی کو؟ کس نے پھینک دیا تھا؟"

ما نے مسحور سا ہو کر پوچھا۔

"کھاتےدار نے۔" بڈھے نے سادگی سے کہا۔

000

شی وار۔ آج ما نے سویرے اشنان کیا۔ بال دھوئے۔ دھوپ میں بال سکھانے بیٹھی۔ پہاڑ کی ٹھنڈی دھوپ۔ یہاں سویرا کتنی جلدی ہو جاتا تھا! با اور بچے اس سے بھی پہلے اٹھ گئے تھے۔ با نے بچوں کو جگایا تھا۔ "بادل!" اس نے اشتیاق سے اطلاع دی تھی۔ علی الصباح بادلوں کے ٹکڑے پہاڑ پر اتر آئے تھے۔ روئی کے گالوں جیسے، بھٹکے بادلوں کے ٹکڑے، کسی اپسرا کے چھپرکھٹ کی طرح، ولا کے دروازے کے عین سامنے اڑتے چلے آ رہے تھے۔ بچوں نے حیرت اور خوشی سے چیخیں ماری تھیں۔ پھر خوف زدہ ہو کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔ کہیں بادل انھیں لپیٹ نہ لیں اور اڑا نہ لے جائیں۔ انھوں نے با کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ سوچا ہو گا با زیادہ بھاری ہے؛ بادل اسے تو نہ اڑا پائیں گے۔ لیکن پاس آتے آتے بادل دھند نظر آنے لگے تھے۔ وہ اس کنبے سے ٹکرا کر ولا کو پار کرتے چلے گئے تھے، جاتے جاتے سب کو گیلا چھوڑ کر۔ بچے چیخیں مار مار کر ہنستے رہے تھے۔ بادلوں نے انھیں سچ مچ چھوا! اڑتے بخارات کے لمس کی گدگدی وہ دیر تک اپنے بدنوں پر محسوس کرتے رہے تھے۔ اب سب اپنے اپنے پروگرام کے مطابق باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

ما دھوپ میں بال سکھا رہی تھی۔ وہ برآمدے سے آرام کرسی گھسیٹ لائی تھی۔ پرانے زمانے کی لکڑی اور بینت کی بنی ہوئی کرسی احاطے میں گھسیٹ کر وہ سورج سے پیٹھ کیے بیٹھی تھی، کہ تیز شفاف دھوپ انکھوں میں نہ پڑے، اور کل کا باسی انگریزی اخبار الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی جو با اسٹیشن سے متصل بازار سے لایا تھا۔ وہ خبروں پر نظریں دوڑا رہی تھی۔ زیادہ تر فلموں کے اشتہار دیکھ رہی تھی ما۔ اس کا دھیان بٹا ہوا تھا۔

بالوں میں انگلیاں پھیر پھیر کر انھیں سکھاتے ہوئے ما نے بلند آواز میں کہا:

"نہ تو صریحاً ناانصافی لگتی ہے۔ بالکل عقل کے الٹ بات ہوئی یہ تو... کہ جس چیز میں

روح ہی نہیں، جو ناسمجھ ہے، بےشعور ہے، وہ تو پھلے پھولے اور بڑھے--- اور جو چیز باشعور ہے، سمجھ دار ہے، وہ بس ساکن و صامت رہے۔ ٹھنٹھ کی ٹھنٹھ۔ کسی سوکھے مارے پیڑ کی طرح۔ بلکہ پتھر کی طرح۔ جس میں تبدیلی نہیں آتی۔ پتا نہیں باہمنوں نے اکیلے بیٹھ بیٹھ کر کیا الٹی مت کی باتیں سوچیں۔ دھوپ میں کھوپڑی پکھل گئی ہو گی۔ مت ماری گئی ہو گی۔ ظاہر ہے۔"

"کون کہتا ہے پتھروں میں تبدیلی نہیں آتی!" بڑکی نے جھولا جھولتے ہوئے پکارا۔ "بالکل آتی ہے۔ مگر ہزاروں برسوں میں۔ ایسا ہماری جیوفزکس کی کتاب میں لکھا ہے۔"

"اور باہمن دھوپ میں نہیں بیٹھتے تھے۔ پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھتے تھے۔" با نے لقمہ دیا۔

ما مسکرائی۔ پھر نہی اسے مادے کی روح پر برتری پسند نہیں تھی۔ مادہ مر جاتا ہے۔ مگر صرف مر جانے سے کیا ہوتا ہے؟ اس کے شعور کی زیریں رو میں یہ بات تھی کہ مر تو سب ہی جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد آتما نہیں مرتی تو نہیں مرتی ہو گی۔ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے، اس سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بات تو زندگی کی تھی۔ آتما کا مطلب اس کے ذہن میں شعور کا تھا۔ آتما کا مطلب اس کے مطابق تھا خیال، احساسات، وغیرہ۔ وہ انہی کو برتر سمجھنا چاہتی تھی۔ ادھڑائی عورت بےچاری! جب کشش ثقل اور پیدائش بچگان کی مشترکہ بیہودہ سازش سے بدن ڈھل رہا ہو، تب وہ روح کی برتری نہ چاہے گی تو کیا بدن کی برتری چاہے گی؟ نہیں! روح ہی برتر ہونی چاہیے۔ اور صرف ہونے سے بھی کیا ہوتا ہے، مانی بھی جانی چاہیے۔ لوگوں کی نظروں میں، اس کی انترآتما نے خواہش کی، آتما ہی کی زیادہ قدر ہونی چاہیے۔

دور جامنوں کے جھنڈ پر لنگور ہُڑدنگے مچا رہے تھے اور رقندیں لگا رہے تھے۔

تب ہی پاس مٹی میں کھیلتے چیکو نے اُلٹی کی۔ "ہائیں! یہ کیا؟" اخبار پھینک کر وہ گھبراہٹ میں کھڑی ہوئی۔ اس نے چیکو کو گود میں اٹھایا۔ ستھری دھلی ساری پر چیکو کی الٹی سَن گئی۔ چیکو کا بدن بخار سے تپ رہا تھا۔

"ڈاکٹر نے کہا تھا بخار ہو سکتا ہے،" با نے اسے تسلّی دی۔ "تم نے اسے دوا کی صبح کی خوراک پلائی؟"

ما نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا۔ چیکو کو ناشتہ کرا کے اسے دوا پلائی تھی۔ لیکن چیکو کو بخار ہو گیا تھا۔ اب چیکو آج سیر پر نہیں جاسکتا تھا۔ اور--- ما بھی نہیں!

با کے تو پوبارہ ہو گئے۔ بےپناہ مسرت کو چھپاتا، چھپانے کی ناکام کوشش کرتا، وہ بےربط جملے بولنے لگا۔

"بہت ضروری ہے۔ سب کچھ ختم ہو چکا۔ سب کچھ لانا ہے۔ میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے تو دکانیں معلوم ہی نہیں۔ اُشا کو جانا ہے۔ اور ہاں، ککلی کو تو بڑکی سنبھال لے گی۔"

بڑکی بال لہراتی آئی۔ آنکھیں مسرت سے تاروں کی طرح روشن۔ "بالکل ما--- تم فکر نہ کرو۔ ککلی کو میں سنبھال لوں گی۔ میں اسے گھومنے والے جھولے پر بٹھاؤں گی۔" اس نے چٹاچٹ ما کے رخساروں پر بوسے دیے۔

ما کے آدھے دماغ نے سوچا۔ بڑکی ککلی کو سیر کراتی ہو گی۔ اتنے دنوں بعد با کو اُشا کے ساتھ تنہا ہونے کا پہلا موقع ملے گا۔ لیکن اس کا آدھا دماغ چیکو کے بخار میں کب کا لگ چکا تھا۔ وہ چیکو کو بانہوں میں بھر کے اندر لے گئی۔ اُشا جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ بجلی کی راڈ سے اس نے خود ہی بالٹی میں پانی گرم کیا۔ چیکو کے منہ اور بدن سے تولیہ بھگو کر الٹی صاف کی۔ پوڈر لگایا۔ اسے صاف کپڑے پہنائے۔ اپنی ساری اور بلاؤز تبدیل کیا۔ چیکو کو چھاتی سے لگا کر تھپکتے ہوئے جب ما نے کھڑکی سے جھانکا تو ککلی، بڑکی، با اور اُشا کا چھوٹا سا قافلہ ولا کی ڈھلان سے اتر رہا تھا۔ سب سے آگے ککلی، سمجھ داری سے جما جما کر قدم دھرتی ہوئی۔ اس کے پیچھے بڑکی، ککلی کی آہستہ روی سے بیزار، لنگوروں کی طرح زقندیں لگانے کے لیے بےتاب۔ اس کے پیچھے تھی اُشا، پُرتمکنت، حسین اور پُرسکون؛ آشنا راستوں پر لاشعوری اعتماد کے ساتھ قدم دھرتی۔ اور آخر میں با، جس نے دونوں ہاتھوں میں خالی سودے کی ٹوکریاں خود ہی اٹھا رکھی تھیں؛ جس کی باچھیں بالکل بڑکی ہی کی طرح کھلی تھیں، اور جو اتنی دور سے بھی اُشا پر واری صدقے ہوتا نظر آ رہا تھا؛ جس کا پیر بار بار رپٹ رہا تھا کیوں‌کہ اسے راستے کا ذرہ برابر دھیان نہ تھا۔

ان کی آن میں وہ سب ما کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ما کسی عامل کے معمول کی طرح چیکو کو تھپکتی رہی۔ ابھی تک اس کا دماغ چیکو میں لگا تھا، لیکن اب، جب چیکو اس کے سینے سے لپٹ کر اونگھ رہا تھا، اور وہ سب جا چکے تھے، اس کے ذہن نے چیکو کی فکر سے آزاد ہو کر پوری صورت حال کا جائزہ لیا تھا، با اور اشا کے بارے میں سوچا تھا، اور ذلت اور غم میں ڈوبنے لگا تھا۔ ما کی انکھوں میں آنسو کھٹکنے لگے۔ سر کو جھٹکے دے دے کر اس نے غم کو بھگانے کی کوشش کی۔ چیکو اس کی بانہوں میں سو گیا۔ جانے کب سے سو رہا تھا چیکو۔ جب کہ وہ اسے گود میں لیے ٹہلے جا رہی تھی۔

ما نے چیکو کو اپنے بستر میں لٹایا۔ حفظ ماتقدّم کے طور پر اس کے نیچے ننھی سی چادر اور پلاسٹک بچھایا (کیوں‌کہ چیکو پیشاب ضرور کرے گا)۔ اسے رضائی اڑھائی۔ پھر کچن میں چلی گئی۔ اس نے ایک بڑا سینڈوچ بنا کر کھایا۔ اسے اتنا نہیں کھانا چاہیے! وہ جرم کے احساس اور پچھتاوے میں ڈوبی۔ وزن نہیں بڑھانا چاہیے اپنا۔ اسے سر کے بل کھڑا ہونا چاہیے، کشش ثقل کے اثر کو رد کرنے کے لیے، اس نے مایوسی سے سوچا۔ کیوں‌کہ وہ ایسا سب کچھ کر نہیں پاتی تھی۔ بھول جاتی تھی۔ ما کا دھیان کہیں اور بٹا رہتا۔

اور ایک بار پھر بالکل ایسا ہی ہوا۔ دھیان بٹانے والی ایسی بات جس سے بڑی شاید ہی کوئی اور ہو سکتی۔ اگر روس اور امریکا میں تیسری عالمی جنگ شروع ہو جاتی تو شاید ما کے ذہن کو کم جھنجھوڑتی۔ جب گول کمرے میں جا کر ما نے وقت ہلاک کرنے کے لیے ٹرانزسٹر ریڈیو لگایا، دوپہر کی خبریں ہو رہی تھیں، اور اسے پتا چلا ان مہاراشٹری پہاڑوں کی ترائی میں تھوڑے ہی فاصلے پر بھیونڈی میں شدید ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے تھے۔

ہندو مسلم فساد تو ہوتے رہتے تھے۔ ہر مہینے کہیں نہ کہیں تو ضرور ہی ہوتے ہوں گے۔ اب اگر وہ بچوں کے اسکولوں کی چھٹیوں میں پہاڑ پر آئے ہوے تھے تو بلوائیوں کو تو اس کی خبر اور پروا نہیں تھی نا۔ یا ہونی چاہیے تھی؟

ما پریشانی میں ریڈیو سنتی رہی۔ خبروں کے بعد فلم کے گیت اسے اچھے نہیں لگے۔ وہ ٹرانزسٹر کی "اے مالک ترے بندے ہم، ایسے ہوں ہمارے کرم، نیکی پر چلیں اور بدی سے ٹلیں، تاکہ ہنستے ہوے نکلے دم" کی پُرسوز التجا کو بددلی سے سنتی رہی تھی، جو اسے پتا تھا کہ ایک مراٹھے ہدایت کار وی شانتارام کی فلم "دو آنکھیں بارہ ہاتھ" میں گایا گیا تھا۔ ما نے یہ فلم دیکھی تھی۔ ٹی وی پر دکھائی گئی تھی۔

"بڑا کم زور ہے آدمی۔ ابھی لاکھوں ہے اس میں کمی۔ پر تو جو کھڑا۔ ہے دیالو بڑا۔ تری کرپا سے دھرتی تھمی۔"

ریڈیو کہہ رہا تھا۔

جی ہاں! ما نے سوچا تھا۔ آدمی اتنا کمزور ہے۔ شانتارام نے اپنی حسین بیوی جےشری کو چھوڑ، سندھیا کو گھر میں ڈال لیا تھا، داشتہ بنا لیا تھا اپنی! اس نے تلخی سے تبصرہ کیا تھا۔ یہ فلم بنا کر۔۔۔ اور یہ گیت گوا کر۔ اس نے سوچا تھا۔ آدمی جو کہتا ہے اس کے الٹ کیوں کرتا ہے؟ یہ بات اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آئی تھی۔ اور وہ سمجھنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ جب کہ اسے اپنے ذاتی معاملات بہتر بنانے کی کم از کم کچھ کوشش کرنی چاہیے تھی۔ جب کہ اسے ذاتی حالات کا کافی غم تھا۔ حالاں‌کہ زندگی کی رواروی میں غم تک کی فرصت آدمی کو کم ملتی ہے۔

گیت چل رہا تھا:

"یہ اندھیرا گھنا چھا رہا۔ تیرا انسان گھبرا رہا۔ ہو رہا بےخبر۔ کچھ نہ آتا نظر۔ سُکھ کا سورج چھپا جا رہا۔"

خالی خالی آنکھوں سے ما سفید دیوار کو تکتی رہی۔

"پر تو جو کرے گا کرم۔ تو (نہ جانے کیا) ہو جائیں گے ہم۔ نیکی پر چلیں۔ اور بدی سے ٹلیں۔"

ما نے ٹرانزسٹر ریڈیو بند کر دیا۔

کھڑکی سے ما کو نظر آیا ولا کی ڈھلان پر دو نفسوں کے خطوط ہابڑتابڑ چڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ آگے آگے بڑکی تھی جس کی چمک دار آنکھیں چکرمکر گھوم رہی تھیں اور چہرے پر سنجیدگی اور کچھ برا منانے کا تاثر۔ گال سرخ ہو رہے تھے، شاید چڑھائی چڑھنے سے۔ لمبے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ چاند کا ٹکڑا لگ رہی تھی پندرہ سال کی اس کی بڑکی۔

اور اس کے پیچھے با تھا۔ سبزی ترکاری، دالوں، دودھ کے ڈبوں، تیل کے ڈبوں، چاکلیٹوں اور گوشت سے ابلتی ٹوکریوں سے لدا پھندا۔ ٹوکریوں سے مسالوں کے پیکٹ ابل ابل کر گرے پڑ

رہے تھے۔ با کے بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھیں ابلی آ رہی تھیں اور منہ سے مارے غصّے کے جھاگ نکل رہے تھے۔

بڑکی اس سے کچھ بھی کہے بغیر، تیزی سے اپنے کمرے کی طرف دوڑ گئی! پورے برآمدے میں اس کی مشک نافہ کی سی خوشبو پھیل گئی۔ کوئی آدھے گھنٹے میں جا کر با اسے پوری بات بتا پایا۔ اس کا غصہ اور گھٹن اس قدر زیادہ تھی۔

ہوا یہ تھا کہ بڑکی کے چڑیل پن نے سارا پروگرام تلپٹ کر دیا تھا۔ با کا ارادہ یہ تھا کہ خریداری کے بعد، یا خریداری کے دوران، بڑکی ککلی کو سنبھالے گی۔ لیکن بڑکی نے ایسا کچھ بھی نہ کیا تھا۔ بڑکی نے آشا کو پٹا اور رجھا کر پہلے ساری خریداری کرا دی تھی، اور جب با گوشت کی دکان میں گیا تھا اور آشا ہندو ہونے کی وجہ سے نہ گئی تھی، تب ککلی کو آشا کے حوالے کر کے بڑکی رفوچکر ہو گئی تھی۔

گوشت کی دکان پر ایک کلو قیمہ اور ایک کلو گوشت تلوا کر، اسے چار پیکٹوں میں بندھوا کر، جب با باہر آیا تھا، اس نے ککلی کے سنگ آشا کو کھڑے دیکھا تھا اور بڑکی غائب تھی۔ جیسا کہ کسی مثنوی میں ایسے موقعوں کے لیے لکھا تھا:

اڑتی چوکی پہ خاک پائی
پردے کی قنات چاک پائی

یعنی کہ داستاں کی اصل ہیروئن ازنچھو ہو چکی تھی۔

بڑکی کہاں گئی؟ اس استفسار پر آشا نے شمال کی جانب منہ کر کے کہا تھا: "وہاں۔ کہتی تھی، ابھی آتی ہوں۔"

گوشت کی دوکان کے سامنے، جب کہ کاغذ کے تھیلوں سے خون رس رہا تھا، با، ککلی اور آشا نے اتنے عرصے تک بڑکی کا انتظار کیا جو انھیں کئی گھنٹے معلوم ہوا۔ ککلی نے دونوں ہاتھوں کا جھولا بنایا اور انھیں دیر تک جُھلاتی رہی۔ اس نے زمین پر بیٹھ کر کنکروں کی قطاریں بنائیں۔ پھر اس نے پہلے جسامت اور پھر رنگ کے حساب سے کنکروں کی الگ الگ کئی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں بنائیں۔ مگر بڑکی شمال کی طرف سے واپس نہیں آئی۔ آخر ککلی کھڑی ہو گئی۔ اس نے سکون سے کہا: "با۔ اب میں جھولے پر بیٹھوں گی۔"

با پریشانی اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے اتنی دیر تک آشا سے فلرٹ بھی نہیں کر سکا تھا۔ ککلی کے صبر پر اور بھی اس کا دل کٹا۔ (با بچوں پر جان دیتا تھا۔) مارے غصّے کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بڑکی کہاں مر گئی؟ وہی تو لے جاتی تمھیں جھولا جھلانے" اس نے غم و غصّے سے تلملاتے ہوئے کہا۔

آشا نے تسلی دی۔

"بابو صاب۔ پھکر نہیں کرو۔ بےبی کو میں سیر کراتی ہوں۔ آپ سامان لے کر بڑکی کو ڈھونڈ لیجیے اور واپس چلے جائیے۔"

ککلی خوشی سے کھلکھلانے لگی۔ اس نے جھٹ اُشا کی انگلی تھام لی۔
با ہڑبڑایا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی ترکیب سوچ پاتا، ککلی اور اُشا جا چکے تھے۔
بڑکی کی تلاش میں، سامان کی کئی ٹوکریاں اٹھائے، با شمال کی طرف گیا۔ لیکن بڑکی وہاں نہیں تھی۔
با جنوب اور مشرق اور مغرب کی طرف گیا مگر بڑکی ان چاروں سمتوں میں نہیں تھی۔
با پریشان ہو گیا۔
بڑکی کو آسمان کھا گیا کہ زمین نگل گئی؟ پریشانی میں وہ ان تمام جگھوں پر گیا جہاں پہلے جا چکا تھا۔ ٹوکریوں سے پیاز اور آلو لڑھک لڑھک کر گرتے رہے۔
اب اگر با بڑکی کو مزید تلاش کرتا تو وہ پریشانی سے بےہوش ہو سکتا تھا۔ اس نے دل کو سختی سے تسلی دی کہ کسی وجہ سے بڑکی واپس وِلا چلی گئی ہو گی۔ اور یقیناً وہیں ہو گی۔ جیسے ہی وہ ولا میں قدم رکھے گا بڑکی اسے نظر آ جائے گی۔
با، لداپھندا، وِلا کی سمت جانے کے لیے، پہاڑی کی چکراتی پگڈنڈیاں چڑھنے لگا، جو ریل کی چھوٹی گیج کی پٹریوں کے ساتھ اور کبھی ان سے ہٹ کر موڑ کاٹتی اوپر جا رہی تھیں۔
ایک موڑ کاٹ کر با کیا دیکھتا ہے کہ ریل کی پٹریوں کے ساتھ دو بڑے پتھروں پر بڑکی بیٹھی ہے۔
اور اس کے ساتھ ایک سولہ سترہ برس کا سانولا، عینک پوش مگر اسمارٹ لڑکا بھی بیٹھا ہے۔ ایک سفید گھوڑا پاس کھڑا چر رہا ہے۔
بڑکی!
با نے پہلے اطمینان کا سانس لیا۔ بجلی کی طرح اطمینان کی لہر تن بدن میں دوڑ گئی۔ اور پھر مارے شدید غصّے کے دل ہی دل میں زاروقطار رویا۔
"بڑکی!" اس نے غصّے کی دردناک چیخ ماری۔ بڑکی نے اچھل کر اس کی طرف دیکھا اور فوراً کھڑی ہو گئی۔ پھر بغیر بال برابر افسوس یا ندامت کے، خوش باشی سے مسکراتے ہوئے بولی: "اوہ با!"
پھر بال لہرا کر بولی:
"رمیش۔ یہ ہیں میرے با۔ اور با۔ یہ رمیش ہیں۔"
انگریزی بول رہی تھی بڑکی۔ جیسے کہ انگریزی فلموں میں ہوائےفرینڈ کا خاندان سے تعارف کراتے ہیں۔
سانولے لڑکے نے فوراً کھڑے ہو کر، مسکرا کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
"گڈمارننگ سر!" اس نے نہایت خوش خلقی سے کہا۔
با غصے، اپنی بنیت کدائی پر شرمندگی، اور جھجک سے چکرا رہا تھا۔ اس نے سر کے اشارے سے مصافحے کی کوشش کا جواب دیا اور زبردستی بانچھیں چیر کر مسکرایا۔ اس نے یہ تک کہا کہ اسے رمیش سے مل کر نہایت خوشی ہوئی ہے۔ اور یہ کہ اس کا کیا اچھا گھوڑا ہے۔ دیگر یہ کہ ایرانی بیکری والے مسٹر کیقباد کی ولا میں شام کو وہ اس کے ڈیڈی کے ساتھ ضرور

چائے پیں گے۔

جس کے بعد سانولا عینک پوش لڑکا اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔ بڑکی نے ٹوکریاں اٹھانے کی پیش کش کی مگر با نے شدید غصّے میں سر جھٹک جھٹک کر انکار کر دیا۔ وہ ولا کی طرف روانہ ہوے، خوشی سے تقریباً اڑتی ہوئی بڑکی کے پیچھے، با قہر و غضب کے بھیانک کالے بادل کی طرح برستا ہوا ولا کی طرف آیا۔

"غیرذمےدار!" با نے داستان سنانے کے دوران اور اختتام پر پچاسویں بار چیخ کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "کوئی بھی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے،" اس نے شدید غم میں سر ہلایا، "کہ یہ لڑکی جو اتنی بڑی ہو گئی ہے، اور دراصل بڑی نہیں ہوئی ہے، مگر پھر بھی کافی بڑی ہے، نہایت ہی غیرذمےدار ہے۔"

ما خاموشی سے داستان سنتی رہی۔ اس کے دل میں ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ با کے رومانی ارادوں کی بڑکی نے اچھی درگت بنائی! لیکن یہ تو قصّے کا ایک پہلو تھا۔ اب رہی بڑکی---

وہ بڑکی کے کمرے میں آئی۔

چالاک بڑکی نے چور نظروں سے بھانپا کہ ما کا غصّہ اصلی ہے کہ مصنوعی۔ وہ لحاف اوڑھے بستر میں پڑی تھی۔ ما کے بارے میں وہ اتنا جانتی تھی کہ کوئی بھی دوسرا ذی روح نہ جانتا ہو گا۔ ما کب ہنستی ہے، کب غصہ کرتی ہے، کب پریشان ہوتی ہے، اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ ما کی تیوریاں تک پہچانتی تھی۔ ہاں ان تیوریوں کا اشارہ مانتی نہیں تھی تو یہ دوسری بات تھی۔ اس بار بھی اس نے ما کی روپوش مسکراہٹ کو اندرونی آنکھوں سے پڑھ لیا۔ فوراً خوشی سے چیخیں مارتی لحاف سے برآمد ہوئی اور ما کے گلے میں جھول گئی۔

جب وہ دونوں پلنگ پر بیٹھیں تو اس نے پھر ما کے گلے میں بانہیں ڈال کر خوشی سے بےقابو ہو کر کہا:

"میں رمیش سے--- رمیش سے ہی بیاہ کروں گی۔"

ما کو اسی بات کی توقع تھی۔ دونوں بانہوں سے بڑکی کو پرے دھکیل کر ما نے ماتھا پیٹا۔ "پچھلے چھ مہینوں میں یہ بارھویں بار تم مجھ سے کہہ رہی ہو۔ اس بکواس کا میں ایک لفظ نہیں سننا چاہتی۔"

"نہیں نہیں ما۔ اس بار یہ بالکل سچ ہے!" بڑکی نے بسور کر کہا۔ پھر وہ شدید رومانی ہو گئی۔ خلاؤں میں تکنے لگی۔ "میرے اور رمیش کے درمیان ایک کیمیکل ری ایکشن ہو رہا ہے ما!" اس نے اونٹ کی طرح گردن چھت کی طرف اٹھا کر کہا۔

"چپ! چڑیل۔" ما نے ڈانٹا۔ پھر زچ ہو کر بولی۔ "دیکھ بڑکی! کیمیکل ری ایکشن ہو رہا ہو یا ایٹمی دھماکا ہو رہا ہو۔ میں یہاں تجھے رومانس وغیرہ نہیں چلانے دوں گی۔ اور بیاہ! ایک نہیں ہزار بار کہہ دیا ہے پہلے پڑھائی پھر بیاہ۔ تم نے آتے وقت وعدہ کیا تھا کہ روز پڑھو گی۔ سپلیمنٹری آئی ہے۔ لڑکی دسویں فیل! کیا میرے جنم میں ٹھکوائے گی؟"

"میں دسویں پاس کر لوں گی۔" بڑکی چنکھاڑی۔ "کہا نا!"

"جب سے آئی ہو میں نے ایک بار تمھیں کتاب کھولتے تک نہیں دیکھا۔ سوٹ کیس بھر کتابیں میں ڈھو کر لائی ہوں۔" ما کو سچ مچ غصہ آ گیا۔ بڑکی سہم گئی۔ اس نے گھبرا کر پوچھا:

"میں رمیش کے ساتھ اس کے گھوڑے پر کل سویرے سیر کے لیے چلی جاؤں؟"

"نہیں!" ما نے کہا۔ "اکیلے اس کے ساتھ کہیں جنگلوں میں جانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔ اور نہ تم شام کو کیقباد کے گھر جاؤ گی۔ اور اب بیاہ کی بات کی تو میں طمانچا رسید کروں گی تمھارے منھ پر۔" ما نے غصّے سے ڈانٹا۔ بڑکی کا منھ اتر گیا۔

بڑکی نے دانت پیس کر کہا: "آشا کو پٹا رہے ہیں با۔"

ما نے کوئی جواب نہ دیا۔ زور سے دروازہ بند کر کے چلی آئی۔ بڑکی اس کی رازدار بیٹی تھی۔ با کے ریشہ خطمی ہونے پر وہ مل جل کر ہنس سکتی تھیں۔ لیکن ما کو کوفت بھی ہوتی تھی۔ غصّے میں بڑکی نے جان بوجھ کر ما کے چٹکی لی تھی۔ ما با کی حرکتوں پر بڑکی کے آگے شرمندہ ہو گئی۔ بڑکی نے بھی آج اچھی حرکت تو نہ کی تھی۔ یوں چپ چاپ غائب ہو جانا واقعی غیرذمےداری کی بات تھی۔ حالاں‌کہ بڑکی بچی ہی تو تھی۔ پھر بھی وہ با کے آگے شرمندہ ہو گئی تھی۔ ملاجلا غصہ اسے بڑکی پر ہی آیا۔

شام تک چیکو کا بخار اتر گیا۔

شام کو کیقباد کے گھر وہ بچوں کو نہ لے گئی۔ اس نے بڑکی سے بات چیت بند رکھی۔ کیقباد وسیع لان میں گجراتی جھولے پر جھول رہے تھے۔ بات لمبی نہ کرنے کے لیے وہ سفر میں کسی کو اپنی جلاوطنی کے بارے میں کچھ نہ بتاتے تھے۔ بس یوں کہہ دیتے تھے کہ دلّی سے آئے ہیں؛ کسی اسکول کالج میں پڑھاتے ہیں۔ دوسری بار کوئی پوچھتا تک نہ تھا۔ کسی کو کیا پتا چلتا ہے! ان کے چہرے مہرے، بول چال والے، ہزاروں لاکھوں مسلمان تو رہتے تھے انڈیا میں۔

کیقباد پارسی تھے۔ بمبئی میں رہتے تھے۔ ان کے دادا یا پردادا نے یہ ولا بنائی تھی۔ پھر ایرانیان بیکری بن گئی۔ سارے سال دھندا مندا ہوتا ہے۔ بس سیزن میں رونق ہوتی ہے۔ کیقباد گجراتی پارسی تھے۔ رمیش کے ڈیڈی سے خاندانی دوستی تھی۔ رمیش کے ممی اور ڈیڈی؛ ممی اچھے ولائتی عطر سے مہکتی، سونے کے زیوروں میں دمکتی، کشیدہ ابروؤں کی بیچ چوڑی بندی لگائے ہوئے؛ ڈیڈی لہجے سے مبہم معلوم ہو رہے تھے۔ اور ما سے خوش اخلاقی کی بھلی باتیں کرنے کے دوران وہ آپس میں بہ سرعت "سون چھے"، "کیم چھے" کہتے ہوئے تبادلۂ خیالات کرتے جاتے۔ رمیش وہاں کچھ دیر بعد پہنچا تھا اور اب لکڑی کے تختے کی طرح سیدھا بیٹھا تھا۔ چھ مہینے میں بارھویں بار ما نے بڑکی کے پسندیدہ لڑکے کو شوق سے دیکھا۔ حالاں‌کہ وہ خوب جانتی تھی کہ یہ سب بڑکی کی بچپنے کی باتیں ہیں، لیکن پھر بھی شوق سے دیکھنے سے باز نہ آئی تھی۔ بس یوں ہی، بےوقوفوں کی طرح۔ لڑکے میں، ماسوا لڑکا ہونے کے، پسند آنے والی تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑکی کے لیے تو لڑکے کا لڑکا ہونا کافی ہوتا تھا۔ لیکن لڑکے تو یہاں

پہاڑی پر بہت سے آئے ہوئے تھے۔ پھر آخر رمیش ہی کیوں؟

"تم نے اس کا گھوڑا دیکھا؟ اس کا گھوڑا؟" بڑکی نے منہ بسور کر تقریباً روتے ہوئے کہا تھا۔

"تو گھوڑے سے کر لے بیاہ!" ما نے پھٹکارا تھا۔ پھر اس نے بڑکی کو سمجھایا،

"یہ گھوڑا وہ ترائی میں نہیں لے جائے گا۔"

مسٹر کیقباد نے کیک پیسٹری کے بعد انہیں سیرکھانڈ کھانے کی دعوت دی۔ گہری زعفرانی مرائھی میٹھی ڈش، ایک بڑی قاب میں ایک حسین اور جوان لڑکی لے کر آئی۔

خاموش اور پُرسکون لڑکی نے میز پر پیالے اور چمچے قرینے سے رکھے۔ اس کے لبوں پر ایک نامعلوم سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے کم قیمت مگر صاف ستھری ساری باندھ رکھی تھی۔ سیرکھانڈ بہت مزےدار تھا۔

"کس نے بنایا؟" ما نے شوق سے پوچھا۔

مسٹر کیقباد مسکرائے۔ لڑکی کی طرف اشارہ کر کے بولے،

"گھر کی مالکہ نے، اور کس نے۔"

لڑکی اسی طرح خاموش، پُرسکون، مسکراتی رہی۔

مہمان کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔ لڑکی برتن لے کر چلی گئی۔ تب شرمندگی مٹانے کے لیے رمیش کے باپ نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا،

"یہ ورلی لڑکی کب سے ڈال لی؟ ہیں؟"

"یہ؟ یہ تو تین چار سال سے۔۔۔" کیقباد ہنسا۔ ما کو یہ بےحیائی لگی۔ "مگر سال میں بس دو مہینے کی بیگم۔ کیا سمجھے؟" کیقباد نے کہا۔

"اور بچے آئیں تب؟" رمیش کے ڈیڈی نے پوچھا۔

"او ہو ہو۔۔۔ ہاں!" کیقباد خوش دلی سے ہنسا۔ "کاٹ کر دیتا ہوں اس کو۔ ایک دم گائب۔ زمین کے نیچے۔ ایکڈم انڈرگراؤنڈ۔" وہ اونچا اونچا ہنسنے لگا۔

"کہاں؟ جنگل میں؟" ما اور رمیش کے ڈیڈی خوشی سے ہنس رہے تھے۔ ما اور رمیش کی ممی میزبان کے لحاظ میں کھیسیں کاڑھ رہی تھیں۔ کیقباد نے اپنا داشتہ رکھنے کا راز مہمانوں کی مرضی کے بغیر، کسی مذاق کی طرح ان کے سر پر دے مارا تھا، اور اب انہیں بھی اس کو مذاق ہی کی طرح لینا تھا۔ رمیش انہیں بیوقوفوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ گناہ اور ڈھٹائی کی یہ دنیا اس کی اپنی معصوم، بھولی بھالی دنیا سے ہزاروں میل کے فاصلے پر تھی۔ یا شاید صرف چند برسوں کے فاصلے پر۔

"غار میں۔ غار میں۔" کیقباد نے زمین کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا غار بھی ہیں؟" ما نے حیرت سے پوچھا۔

"مذاق کرتے ہیں یہ!" رمیش کے ڈیڈی نے ہنس کر کہا۔

"پن غار تو ہیں،" کیقباد نے ہنستے ہنستے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "برابر ہیں غار۔ کیوں نئیں ہوں گے!" اس نے کہا۔

ooo

"اور اگر بچہ ٹھہر جائے--- تب؟"

ما نے یہ سوال دیر تک چپ رہنے کے بعد با سے پوچھا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں وہ تیزی سے ادلتی بدلتی پگڈنڈیوں پر اپنی ولا کی طرف آ رہے تھے۔ جب وہ کیقباد کے گھر سے رخصت ہوے تھے تب صاف اجالا تھا۔ پگڈنڈی کا ایک موڑ کاٹا اور اچانک اندھیرا۔ گویا وہ وقت کے کسی علاقے کو اچانک پار کر گئے ہوں۔ سورج اچانک ڈوب گیا، جیسے پہاڑوں پر ہوتا ہے۔ احتیاطاً ساتھ لائی ٹارچ کام آئی۔ اب وہ سوئے ہوے درختوں کی شاخیں احتیاط سے پکڑ پکڑ کر اوپر چڑھ رہے تھے، درختوں کے تنوں اور اندھیرے پتوں کے پراسرار گچھوں میں خوابیدہ جانداروں کو اچانک بیدار کرنے سے خوفزدہ۔ فاصلے سے ولا کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ ٹرانزسٹر ریڈیو بج رہا تھا۔

"انتظام کرتے ہیں---" ذرا توقف کے بعد اندھیرے میں با کی آواز آئی۔ "رکھیلوں کے ساتھ کچھ انتظام تو کرنا پڑتا ہے۔" با نے سکون سے کہا۔ اس کی آواز میں پُراعتماد دنیاداری تھی۔

ما پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اس کا پیر رپٹ رہا تھا۔ لیکن اسے سہارا کون دیتا! اس وقت اگر کوئی بھوت بھی ہوتا تو ما اس کی بانہہ تھام کر جلد سے جلد ولا پہنچ جاتی۔ اسے فکر ہونے لگی تھی۔ جیکو کو بھر سے بخار تو نہیں ہو گیا۔ ایک اور موڑ کاٹا تو سامنے واقعی بھوت سا نظر آیا۔ ٹارچ کی روشنی دو مردانہ قدموں پر پڑی۔ با نے ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ ارے، سواجی!

سواجی ٹنکی والا چپ چپاتے ولا کی طرف جا رہا تھا۔

"اس وقت کہاں؟" با نے دوستی سے پوچھا۔ وہ محنت کش طبقے کے ہر آدمی سے پل بھر میں دوستی کر سکتا تھا۔ کوئی ایسا گُر آتا تھا اسے۔

ما نے جلدی سے بات بنائی۔ "ٹنکی چلا کر آ رہا ہو گا۔ پانی ختم ہو جاتا ہے شام تک۔"

سواجی کو سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا کہے؛ وہ آ رہا تھا کہ جا رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کی آنکھیں چمکیں۔ موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں آپ کو دوسرا راستا بتاتا ہوں۔ یہ بہت لمبا ہے۔ چلیے میرے ساتھ۔"

وہ انھیں ایک چھوٹے مگر زیادہ مشکل راستے پر لے چلا۔ لمبے ڈگ بھرتی ما سب سے آگے نکل گئی۔ وہ ڈال پکڑ پکڑ کر جلد سے جلد اوپر پہنچنا چاہ رہی تھی۔ شاید ڈال ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ پل بھر میں وہ سواجی کی بانہوں میں تھی، جس نے ما کو کھٹ سے جھیل لیا تھا۔

دوسرے ہی پل وہ الگ ہو چکے تھے۔ ما کے نتھنوں میں پسینے اور میل کچیل کی ملی جلی

مرجھائی خوشبو رچ گئی تھی۔ کوئی پرندہ گھونسلا بل جانے سے بےچینی اور وحشت سے پھڑپھڑایا۔ سمجھیں اب وہ ولا تک پہنچ ہی چکے تھے۔ شاخوں میں تقریباً جھولتی، لمبے سے لمبے قدم بڑھاتی، وہ ولا کے دروازے تک جا پہنچی۔ ورانڈے کے بلب کی کمزور روشنی احاطے میں پھیلی تھی۔ سب بیٹھے تھے۔ اس کی گود میں چیکو۔ آشا چیکو کو کھانا کھلا رہی تھی۔

"تمھیں تو نہیں ہوا ہے؟" اس کی طرف لپکتے ہوئے ما نے پکارا۔ کتنی اچھی تھی آشا! کیسے پیار سے سنبھالے تھی چیکو کو۔ لمحے بھر کو، آشا کی گود میں چیکو، ما کی آنکھ میں تصویر سا بنا۔ لگتا ہے جیسے یہی اس کی ماں ہے۔ یہ خیال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح چمک کر غائب ہوا۔ وہ ان کے پاس پہنچ چکی تھی۔

"نہیں ما جی۔" آشا نے چیکو کو ما کی گود میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے لیے کھانا لانے چلی گئی۔

چیکو ابھی تک جاگنے میں لگے ہوئے تھے۔ نو ساڑھے نو کے بعد، جیسے گھڑی دیکھ کر، ان کے دل کے دل جاگنے میں زمین رنگنے لگتے تھے۔ شکتی کمرہ میں تھی۔ پتا چلا ان کے نکلنے کے فوراً بعد رمیش سفید گھوڑے پر سوار آیا تھا۔ اس نے لڑکی کو اپنے ساتھ سیر پر لے جانا چاہا۔ مگر آشا اور شکتی نے لڑکی کو نہیں جانے دیا۔ شکتی لڑکی کی قسمت سے تنگ گئی تھی۔

"نہیں! ما نے منع کیا ہے۔"

اوہو! تب ہی مجھ سے سنتھیا نہ بولی۔ ما نے سوچا۔ یہیں سے نامراد وہ کمقماد کے گھر آیا تھا۔ مگر رمیش میں وہ بہت خوش نہیں تھا۔ ایک سفید گھوڑا لیے رمیش آیا ہوگا۔ اس نے قیاس کیا۔ اس غصہ میں نے مشکل سے اسے نکال کر رمیش ڈھونڈ نکالا۔

غصے اور کھینچ سے لڑکی کانپ ہی رہی تھی۔ وہ اب اور خاموش سے جھنڈ کے عین نیچے غصے سے سر پٹک پٹک کر ... وہاں سکوروں سے ٹک رہا تھا۔ اور جو کوئی لنگور اس سکوتر پر جھولتا ہی تھا۔ ما نے نہیں کہا سوچا۔ اس نے آواز میں غصہ بھر کر لڑکی کو پکارا۔ "نہیں، ڈرو بیٹی۔"

پہلے وہ رکی۔ پھر یوں ہی ہر شاخ پھونکتی رہی۔ لیکن جب ایک لنگور سچ مچ کھڑکھڑایا تو وہ بھاگی۔

لیکن دو تین بار بھی ہی کر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ وہ منہ بھر بھر کر چیونگ گم چباتی رہی۔ جو وہ درختوں کے جھنڈ کے نیچے جانے کب سے چبا اور تھوک رہی تھی۔

"یہ آپ لوگ... کس قدر فراڈ ہیں آپ لوگ!" وہ تلملائی۔ "ڈیموکریسی... آپ لوگ ڈیموکریسی جیسے ہیں؟ ڈکٹیٹر ہیں سالے ڈکٹیٹر!" اس نے سر پر مکے مارے۔ "سب فراڈ!" اس نے کہا۔

ما نے جھرجھری لی۔ لڑکی نے سردمہری اختیار کی۔ برف کی سل کی طرح خاموش ہو گئی۔

ولا میں وہ اکیلا ہی آیا تھا۔ "سوامی جی نہیں آیا۔ کہتا تھا واپس چلا جاؤں گا۔" ما نے بتایا۔

"ہوں۔" ما نے کہا اور ورانڈے کی بتی کی طرف دیکھا، جیسے وہ کھانا کھانے کے بعد بجھا دے گی۔

بڑکی کھانے پر نہ آئی؛ ماں نے بھی نہ بلایا۔ ایک رات کھانا نہ کھانے سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑنے والا، ما نے کٹھورپن سے سوچا۔

ککلی کو سلا کر، خبروں کے لیے ٹرانزسٹر لگایا۔ بھیونڈی کے فسادات کا ذکر نہ تھا۔ کئی منتری کئی دوسرے منتریوں سے ملے تھے، ان کی ہی کتھا سناتی رہی نیوزریڈر۔ ما اور با نے اطمینان کا سانس لیا۔ "ختم ہو گئے ہوں گے فساد،" با نے پُرامید ہو کر کہا۔ "کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔"

"کپڑامنتری رکھشامنتری سے ملے۔" نیوزریڈر نے کہا۔ ما اور با پل بھر خاموش رہے اور پھر زور سے ہنس پڑے۔ انھوں نے چشمِ تصوّر سے ایک کپڑے کا گدّا اور ایک رکشا چلاتا آدمی دیکھا تھا۔ ان لفظوں سے ان کی زندگی بھر گئی۔ دوسری طرح کی پہچان انھیں ایسا ہی دکھا سکتی تھی۔

کمرے میں۔ بستر پر۔ با کے ساتھ۔ (ما نے وارانڈے کی بتّی بجھا دی تھی۔) جب انھیں یقین ہو گیا کہ پورا سنسار سو چکا ہے، تب انھوں نے اپنی بیدارخواہش کیں۔ ما نے اپنےآپ کو سواجی ٹنکی والے کے سپرد کیا۔ ایک پل کے سیس‌لانگ، ایڑی سے چوٹی تک کے لمس میں اس پر یہ حیران کن انکشاف ہوا تھا کہ صرف دیکھنے ہی میں نہیں، چھونے میں بھی سواجی ٹنکی والا با کے جڑواں بھائی جیسا تھا۔ وہی لانبا قدبُت، چکلی چھاتی، لمبی لمبی ٹانگیں اور گٹھی بانہیں۔ ہاں۔ مگر وہ با نہ تھا۔ وہ اس کے سنگ جو چاہے کرے۔ انھیں ایک دوسرے سے محبت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ بس ایک بدن تھا۔ اس مِتھن سے بچہ بھی نہیں ہو گا، ما نے سکون سے سوچا تھا۔

با نے آشا کے سنگ محیرالعقول جنسی کارنامے انجام دیے۔ پھر اس نے ما کی طرف دیکھا۔ ما ہموار سانسیں لیتی لیٹی رہی۔ اب با کیا کرے گا؟ اس نے شدید تجسّس سے سوچا۔ تصوّر میں دوسرے آدمی کے ساتھ ہو کر ما کا دل پُرسکون ہو گیا تھا۔

با بستر سے اٹھا۔ پنجوں کے بل چلتے ہوئے اور ذرا سی بھی آواز کیے بغیر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

ما اندھیرے میں جی بھر کر مسکرائی۔ تھوڑی دیر میں فاصلے سے دبی دبی آوازیں۔ ذرا سی دیر میں با واپس آ چکا تھا۔ اس کا سارا اعتماد کہیں چکناچور ہو گیا تھا۔ پھوہڑپن سے دروازہ کھولا تو اندھیرے میں زور سے چرچراہٹ ہوئی۔

"کیا ہے؟" ما نے سوتی آواز بنا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ باتھ روم۔" با نے بڑبڑا کر کہا۔

ما نے لمبی سانس لی۔ تو معلوم ہو گیا با کو، آشا کی کوٹھری میں کون ہے۔ اس نے دل میں ہنس کر سوچا۔ تھوڑی دیر میں دونوں سو گئے۔

ooo

بدھ وار۔

"اب میری باری۔" ما نے کہا۔

اس نے بچوں کی ایک نہ سنی تھی۔ بڑکی پر برفیلی نظریں ڈالی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح وہ ایک دن صرف اپنے لیے نکال ہی لیتی تھی۔ ہر بات میں تھوڑے سے، بالشت بھر حصّے پر میرا بھی حق ہے۔ برسوں پہلے اس نے منصفی سے فیصلہ کیا تھا۔ ما نے پہاڑ گھومنے کا یہ دن چُنا تھا۔ چیکو ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا اور فرش پر کھیل رہا تھا۔ ککلی جھولے پر بیٹھی تھی۔ بڑکی منھ تُھتھائے بستر میں پڑی چھت کو ٹکر ٹکر تک رہی تھی۔ ما نے ذرا پروا نہ کی۔ وہ با کو ساتھ لے کر نکل کھڑی ہوئی۔

چھوٹی بڑی سات پہاڑیاں تھیں جنھیں ملا کر یہ پہاڑی اسٹیشن بنایا گیا تھا۔ ولا ایک پہاڑی کی چوٹی پر تھی۔ پگڈنڈیوں سے اترتے اور چڑھتے وہ سب سے اونچی پہاڑی کی چوٹی کی طرف جا رہے تھے۔

بس اسٹاپ پر ورلی عورتیں اور مرد قلی۔ بسوں میں سامان لادتے ہوئے۔ جانے کیوں ما کو لگا جیسے اچانک کئی سیاح واپس جا رہے ہوں۔

پہاڑی پر چڑھتے ہوئے انھوں نے کاشٹے کے لنگوٹ باندھے ورلی عورتوں کو ایک قطار میں بوجھ ڈھوتے دیکھا۔ ما ان سے باتیں کرنے لگی۔

"آج شاید بارش ہو۔" اس نے آسمان پر اودے بادلوں کے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

"بارش؟ ابھی کہاں!" قلی عورت نے کہا۔ "یہ مہینا جائے، تب بارش ہو گی۔ تب تو یہاں آدمی بھی نظر نہیں آئے گا۔"

"کیوں؟" ما نے حیرت سے کہا۔ "پہاڑ پر تو بارش بہت اچھی دکھتی ہو گی؟"

"اس پہاڑ پر نہیں!" ورلی عورت ہنسی۔ "بارش ہو گی نا بائی، تو یہ ساری مٹّی بہہ جائے گی۔" اس نے سرخ مٹی کی طرف اشارہ کیا۔ ما اور ورلی آدھی بات اشاروں میں کرتے تھے۔

"کیا سچ مچ؟ واقعی؟"

"ہاں۔ مٹی بہہ جاتی ہے۔ پتھر نکل آتا ہے پتھر۔"

تبھی شاید یہاں کچھ اُگتا نہیں۔ ما نے حیرت اور کچھ تاسّف سے سوچا۔ جامنوں کے جھنڈ اور اکّادکّا جھاڑجھنکار کے سوا، ان پہاڑوں پر ہریالی نہ تھی۔ ما نے چشمِ تصوّر سے ساری سرخ مٹی کو بہہ جاتے دیکھا۔ اس نے تصوّر کیا جیسے پہاڑ کی سفید سفید ہڈیاں نکل آئی ہوں۔ جیسے بدن سے سرخ گوشت کی پرت ہٹ جائے۔ شاید ایسا نہ ہوتا ہو گا، اس نے خیال کیا۔

پہاڑ کی چوٹی سے، آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر، ما نے دور دور نظر دوڑائی۔ چاروں طرف مہاراشٹر کے مغرور، بنجر، بازالٹ کے اونچے ہیبت ناک پہاڑ اپنی قدیم خاموشی میں کھڑے تھے۔ دور دور تک پانی کا، کسی ندی نالے کا نام نشان نہ تھا۔

"تب پانی کہاں سے آتا ہے یہاں؟" اس نے سرگوشی میں، گویا خود سے پوچھا۔
"کنواں کھودتے ہیں،" سواجی ٹنکی والے نے بتایا تھا۔
"اور یہ اتنے گھنے ترائی کے جنگل؟"
"مون سون!" بمبئی میں، سنچری بازار کے پاس، پارٹی آفس میں کامریڈ گوینکر نے بتایا۔ "اسی کارن مراٹھے جنگجو بن گئے۔ یہ علاقہ زرخیز نہ تھا۔"
"غیرت کے مارے نہیں؟"
وہ ہنسے۔ "پتا نہیں۔" پھر انھوں نے کہا: "غیرت تو سب میں ہوتی ہو گی۔ میرا مطلب ہے، زرخیز میدانی علاقوں میں بھی۔ لیکن وہاں کے لوگ جنگجو نہیں ہوتے۔ اب اپنے پنجاب ہی کو لیجیے۔ اتہاس میں مستقل باہر کے لوگ حکومتیں کرتے رہے وہاں۔ اور مضبوط باڑ کے پنجابیوں نے انھیں کچھ بھی نہ کہا۔ ذرا بھی نہ لڑے۔ تو کیوں؟"
"کیوں نہ لڑے پنجابی؟" ما نے خودکلامی سی کی۔
"زمین زرخیز تھی،" گوینکر ہنسنے لگے۔ یہ تھی اصل وجہ، نہ لڑنے کی!
"پھر سترھویں صدی میں، اسی سرزمین سے سواجی مرہٹہ اٹھا اور طوفان کی طرح ہندوستان پر چھا گیا، مغلوں کی اینٹ سے اینٹ بجاتا۔"
"عجیب و غریب تحریک تھی!" کتابوں میں پڑھی تاریخ کو رد کرتے ہوئے ما نے تبصرہ کیا تھا۔ اسے سواجی کا دھوکے سے اورنگ زیب کے سپہ سالار، فضل خاں کو قتل کرنا یاد آیا۔ مغلوں کے اس ہندوستانی سپہ سالار سے معانقہ کیا تھا سواجی نے، اور پشت میں خنجر گھونپ دیا تھا۔ "ایک ہی حضرت تھے سواجی بھی!"
"اوہ! وہ..." گوینکر ہنسے۔ "سو تو ہر مراٹھی ہندو، اور ہر مسلمان کو آج بھی یاد ہے۔"
"مگر جےسنگھ کے ہاتھوں سواجی کی شکست کسی کو یاد نہیں،" ما نے تبصرہ کیا۔ اس کی دلی تمنّا تھی کہ ان جنگوں کو مذہبی رنگ میں نہ دیکھا جائے۔ (لیکن اس کی دلی تمنّا کی کسے پروا ہو سکتی تھی؟) سواجی نے ہندو دھرم ہی کا نعرہ بلند کیا تھا۔ دیش کی آزادی کا، گئورکھشا کا، ہندو دھرم کا۔ مراٹھا گوریلے نے براہمنوں کا شودروں تک کے ساتھ ملاپ کرا دیا تھا۔ کیسا رومانی کردار تھا سواجی کا! جےسنگھ کے ہاتھوں گرفتار ہو کر، اورنگ زیب کی قید سے پھلوں کی ٹوکری میں چھپ کر فرار ہونے والا، نڈر، زیرک، پھرتیلا جنگجو! پھر کیا تعجب ہے کہ مراٹھی مائیں اپنے بیٹوں کا نام سواجی رکھتی ہیں! اگر وہ مراٹھن ہوتی تب؟ لیکن اس کے دل نے کہا کہ وہ چیکو کا نام سواجی نہ رکھتی۔ لڑائی جھگڑے اسے پسند ہی نہ تھے۔ کیا رکھتی وہ چیکو کا نام، اگر وہ مراٹھن ہوتی تب؟
"جنان ایشور،" گوینکر نے مدد کی۔ "شاعر تھے۔ بھگود گیتا کا مراٹھی میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ اسی طرح مراٹھی زبان کی نوک پلک ٹھیک ہوئی۔ عجب اتفاق تو یہ ہے،" انھوں نے کہا، "سواجی سے دو صدی پہلے بھگتی تحریک ہندوستان کے انھی پچھمی گھاٹوں سے نکلی، جسے آج مہاراشٹر کہتے ہیں۔ گیتا کو مراٹھوں نے سنسکرت سے پہلی بار عوامی بولی میں لکھا اور اس کا پیغام تھا محبت!"

"جنان ایشور براہمن تھا؟" ما نے تجسس سے پوچھا۔ "آریا؟"

"ارے نہیں بھئی۔ سب برہمن آریے کہاں تھے! کتنے ہی تو بھی آدی واسی ہیں۔"

"آدی واسی؟ وہ براہمن کیسے ہو گئے؟"

"قبیلوں کے سردار بن جاتے تھے براہمن۔" گوبنکر نے سمجھایا۔ "براہمنوں کو پیسے دے دلا کر۔" (سیدھی سی بات تھی۔ ما کی سمجھ میں کیوں نہ آئی؟) "ایک بڑا سا سونے کا برتن بنایا جاتا تھا۔ گویا سمجھو گربھ۔ سردار اس میں بٹھایا جاتا۔ بڑا سا یجنا ہوتا۔ پھر سردار باہر نکلتا۔ گویا دوبارہ پیدا ہو رہا ہے۔ بس بن گیا برہمن! اسے ہرنیہ گربھ کہتے تھے۔ یعنی سونے کا گربھ۔"

"اہا! جاتی بدل جاتی تھی؟" ما نے خوش ہو کر کہا۔ پھر وہ بڑبڑائی: "ہماری طرف بھی کئی شیخ پاکستان جا کر سید ہو گئے۔"

"تب آدی واسی ہندوؤں میں مل گئے ہیں کیا؟" اس نے سوچ سوچ کر کہا۔

"بے شمار۔"

"شودر ہو کر؟"

"نہیں تو! کتنے ہی تو سورن ہندوؤں میں شامل ہیں۔"

وہ سوچتی رہی۔ الغرض یہ ایک لمبی چوڑی کھچڑی پک چکی ہے۔ نمک کھچڑا۔

"تو پھر یہ کون ہیں؟ یہ آدی واسی؟"

"یہ جو رہ گئے۔"

"شواجی کی ہندو دھرم کی تحریک کا ساتھ باقی ہندوؤں نے نہ دیا۔ کیوں نہ دیا؟ ایک تاریخ سے تعلق تھا۔ یہ قسم کی کچھ نوٹنکی تو۔ مراٹھوں کی نظر میں ہندو ہونا اور مراٹھا ہونا ایک ہی بات تھی۔ سو اس لیے دوسرے علاقوں کے ہندوؤں نے خاطرخواہ جواب نہ دیا۔"

"کیا جواب دیا؟"

"انہوں نے تنہا سمجھا۔"

"سب پھر جو اگر سب ٹھیک ہے۔ تو یہ جو تحریکیں چلتی ہیں کہ ہم ہی سب سے بہتر، اور خالص، اور اعلیٰ..."

"گدھا پن ہے۔" گوبنکر مونگ پھلی کھانے لگے۔ پھر انہوں نے ما کو تسلی دی: "کبھی کبھی لوگوں پر سوار ہو جاتا ہے۔"

ما نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ما سے بہتر کون جان سکتا تھا؟ ما تو پاکستانی تھی۔

لیکن یہ سب باتیں تو بہت بعد میں ہوئی تھیں۔ اس وقت تو ما نے صرف ایک لمبی تھکن بھری نظروں سے ڈالی تھی جو شاید کسی سمت رواں ڈوبے کی اچانک منجمد ہو جانے والی لہروں کی طرح لہلہاتے ٹھہرے تھے اور اداسی سے واپس لوٹنے لگی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی

تھی کہ اس کا دل اتنا بھاری کیوں ہے، جب تک ہوا کا ایک جھونکا سرسراتا ہوا نہ گزرا۔ کب سے اس کی نظر جامن کے تنے سے پھوٹتی شاخ پر لگی تھی۔ ہوا سرسراتی گزری تو بھاری، گہرے کاہی رنگ کے پرانے پتّوں پر اثر نہ ہوا۔ بس ایک نوخیز ہلکے دھانی رنگ کا پتّا مضراب سے چھیڑے تار کی طرح شدّت سے لرزنے لگا۔ ما کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس کی انکھوں میں پانی امڈ آیا۔ "بڑکی،" اس نے سوچا، "بڑکی!" اور پچاسویں بار اپنی بیٹی کو کبھی نہ ڈانٹنے کا عہد کیا، جسے وہ نبھا نہ سکے گی۔

با آگے آگے جا رہا تھا۔ اُشا کی کوٹھری میں سواجی کو دیکھ کر اس کی ہمّت پست نہ ہوئی تھی۔ دوسری بار سوچنے پر تو موقع اور بھی شاندار تھا۔ جب کہ عورت ہے ہی ایسی، تو پھر اب کیا مشکل تھی؟ اب تو مسئلہ صرف سواجی کو ایک ادھ دن کے لیے کسی بہانے ادھر اُدھر کر دینے کا تھا۔ اس کا ذہن ترکیبیں سوچ رہا تھا۔

ما سر جھکائے پیچھے پیچھے چلی آتی تھی۔ پریشان اور اکتائی ہوئی عورت! بہار کی خوشگوار اوزون بھری ہوا نے بڑکی اور با کی جسمانی امنگوں کو بےمہار کر دیا تھا جو سرپٹ دوڑی جا رہی تھیں اور ان میں کسی کا بھی رخ اس کے ذہنی سکون اور اس کے وجود کے اثبات کی طرف نہ تھا۔ دو رات پہلے ہی بےوقوف بڑکی مکالمے بول رہی تھی:

"آپ تو با کے ساتھ آئی ہیں۔ اور میں؟ میں کس کے ساتھ آئی ہوں؟"

"بھئی اپنے بہن بھائی کے ساتھ۔"

"اوں ہوں۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟" بڑکی شرمندہ ہو کر اور بھی جھنجھلائی تھی۔ "آپ تو ان سب کے ساتھ آئی ہیں۔" اس کی نظر میں فی الحال دنیا جوڑے جوڑنے کے سوا کچھ بھی نہ تھی۔

"میں کسی کے بھی ساتھ نہیں آئی ہوں۔" اس نے کہنا چاہا تھا۔

ٹنکی جل گئی۔ پانی کی ٹنکی۔ صبح سویرے با اور سواجی ولا کی چھت سے لٹکے، ٹنکی میں ہاتھ ڈال ڈال کر کوئی اسکرو کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیچے وہ سب کھڑے تھے، اُشا، ما، اور تینوں بچے۔ با اور سواجی کے ادھے دھڑ ٹنکی میں گھسے ہوئے تھے۔ وہ سب انکھوں پر سایہ کیے اوپر تک رہے تھے جہاں چار لمبی ٹنکی مردانہ ٹانگیں الجھ رہی تھیں۔ سانولی، لمبی، بالوں بھری ٹانگیں۔

بہرحال ما با کی ٹانگوں کو پہچان سکتی تھی (گو وہ اس سے کوئی دلی مسرّت محسوس کرنے سے قاصر تھی۔) کیا اُشا پہچان سکتی ہے؟ اس نے تجسّس سے اُشا کو تاکا، اور مایوسی سے محسوس کیا کہ اُشا کا چہرہ پڑھا نہیں جا سکتا۔ اس کے خیالات کا اندازہ لگانا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ کب نفرت محسوس کرتی ہے، کس سے محبت کرتی ہے، کس بات سے خوش ہوتی ہے، کس بات پر اسے غصہ آتا ہے؟ ما یہ سب بالکل نہیں سمجھ پائی تھی۔ اس کے چہرے پر سدا

یکساں شانت تاثر رہتا۔

لیکن با کی مراد بر آئی تھی۔ چھت سے چھلانگ لگا کر، کمرے کی منڈیر پر کھڑے ہو کر اس نے اعلان کیا کہ ٹنکی ٹھیک ہونے کے لیے جن فاضل پرزوں کی ضرورت ہے -- اور جو جل گئے ہیں -- وہ اس پہاڑ پر دستیاب نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا سواجی کو ترائی میں قریب ترین اسٹیشن جانا پڑے گا۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے، جب دو مردوں کے آدھے دھڑ ٹنکی میں گھسے تھے اور ان کے الٹے لٹکے سروں کے نیچے تاریک پانی بلبلے بنا رہا تھا، تب انھوں نے کیا باتیں کی تھیں، اور با نے سواجی کو کیا پٹی پڑھائی تھی۔ یوں بھی اُشا کون سی سواجی کی بیاہتا تھی۔ وہ تو سواجی کی محبوبہ بھی شاید نہ تھی۔ سواجی یوں ہی اس کے پاس آ جاتا تھا۔ جو روپے با نے دوڑ کر اسے کمرے سے لا کر دیے، اس کو شاید مفت میں مل گئے۔ دھوتی کا لنگوٹ کسے، سواجی ہنستا مسکراتا وِلا کی ڈھلان اتر گیا، جامنوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ بچے سیر پر جانے کی تیاری کرنے لگے۔

"پانی زور لگا کر کھینچنے سے پہاڑی پر مشین باربار جل جاتی ہے بائی،" اُشا نے ما سے کہا۔

"پہلے بھی جلی ہے کیا؟"

"ارے ہاں! بہت بار۔"

"تب تم پانی کہاں سے لاتی ہو؟"

"نیچے سے۔ کنواں ہے وہاں۔"

"اچھا... تو۔" ما نے فیصلہ کیا، "ہم تم دونوں نیچے کپڑے دھونے چلیں گے۔ با بچوں کو اکیلے سیر کرا لے گا۔"

اُشا اور ما احاطے میں کھڑے تھے۔ بڑی بڑی ہلکی بھوری آنکھوں والا ایک بھورا سا لنگور، بےتحاشا لمبی دم سانپ کی طرح پھنکارتا، عین ان کے سامنے زمین پر دھم سے کودا۔ ہلکی سی چیخیں مار کر دونوں عورتیں پیچھے کی طرف دوڑیں۔ محفوظ فاصلے سے جھانک کر دیکھا تو لنگور زمین پر قلابازیاں سی لگا رہا تھا۔

"یہ کیا کر رہا ہے؟" ما حیران تھی۔ پھر اس نے غور سے دیکھا۔ لنگور کے منھ پر چیونگ گم ٹھپا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پر بھی چیونگ گم سَن گیا تھا، ربڑ کی لمبی سی تار کی طرح۔ لنگور باربار اسے منھ کے نزدیک لاتا اور دور لے جاتا۔ تار اور بھی لمبا ہوتا جاتا۔ ذرا سی دیر میں اپنےآپ کو لنگور نے چیونگ گم کی ڈوریوں میں باندھ لیا۔

ما تھوڑی دیر دیکھا کی۔ پھر ہنسی سے دوہری ہو گئی۔ بڑکی کے ٹھوکے چیونگ گم، جامنوں کے نیچے۔ اسے یاد آیا۔

یہ لنگور با ہے، اس نے سوچا، اور یہ چیونگ گم... یہ چیونگ گم، مَیں۔

با کی ایک نہ چلی۔ بچوں کو اسے اکیلے ہی گھمانے لے جانا پڑا۔ دونوں عورتیں میلے کپڑوں کی بالٹیاں سنبھالے پہاڑی اترنے لگیں۔ جب وہ ریلوے اسٹیشن جانے والی پکّی سڑک تک پہنچیں

تو انہیں عینک پوش رمیش اپنے سفید گھوڑے پر سوار آتا دکھائی دیا۔ ما اور اُشا خبردار ہو گئیں۔ انھوں نے راستے سے ہی خطرے کو لوٹا دیا۔ "بڑکی با کے ساتھ بازار گئی ہے۔ آج نہ مل سکے گی،" انھوں نے کہا۔ مایوس لڑکا سر لٹکا کر واپس جانے لگا۔ لیکن وہ گھوڑا موڑ کر پھر واپس آیا۔

"آنٹی۔ یہ بہت ضروری تھا۔ دراصل ہم--- واپس جا رہے ہیں۔"

ما حیران ہوئی۔ حالاں‌کہ اس کے دل سے بوجھ سا ہٹ گیا۔ شدید مطمئن ہو گئی ما۔ چلو ایک طرف سے تو فرصت ہوئی، اس نے سوچا۔ "ایسا تو تمہارے ممی ڈیڈی کا پروگرام نہ تھا؟" ما نے کہا۔

"نہیں۔ لیکن--- بمبئی سے فون آیا ہے۔ کچھ گڑبڑ ہے،" اس نے کچھ جھجھک کر کہا۔ پھر اس نے جیب سے کاغذ نکالا۔ "میرا ایڈریس ہے آنٹی۔ دے دیں گی نا آپ اس کو؟" اس نے ملتجیانہ انداز میں پوچھا۔ ما کا دل پگھل گیا۔ "ضرور،" اس نے کہا، اور کاغذ تہہ کر کے اپنے بلاؤز میں رکھ لیا۔ بمبئی میں تو ہرگز نہیں، اس نے دل میں سوچا، مگر دلّی پہنچنے پر وہ یہ پتا بڑکی کو دے دے گی۔ پھر اس نے اضافہ کیا، سپلیمنٹری کے بعد بھلے ہی قلمی دوستی کرے۔

"کیا آج ہی جا رہے ہو؟"

"ہاں۔ شاید آج ہی۔"

ما نے کچھ سوچ کر کہا، "وہ لوگ بڑی مال روڈ پر گئے ہیں۔"

"تھینک یو آنٹی!" رمیش نے ایڑھ لگائی اور مشّاقی سے اپنا شان دار گھوڑا دوڑاتا راستوں کے پیچ و خم میں اوجھل ہو گیا۔ رمیش کو دھوکا دے کر (وہ لوگ کسی دوسری طرف گئے تھے) یہاں بڑکی اور اس کی ملاقات کا امکان ختم کر کے دونوں عورتیں کچّے راستوں سے سڑک سے نیچے اترنے لگیں۔ ما کو پہاڑی سے اس طرح اترنا نہ آتا تھا، جب کہ اُشا ہرنی کی طرح چھلانگیں لگا سکتی تھی۔ ما باربار اُشا کا سہارا لیتی۔ کون اس بات کو سمجھے گا اور جانے گا کہ سرخ پہاڑ کی پوری مشکل ڈھلان ما نے اُشا کے سہارے طے کی۔

نیچے شاید کبھی ڈائنامائٹ سے پتھر اڑا کر شگاف ڈالے گئے تھے۔ وہ جیسے جیسے نیچے جا رہی تھیں، ہریالی بالکل ختم ہوتی جاتی تھی۔ ان کے چاروں طرف سرخ پتھروں کے شگاف بڑے بڑے دہانے کھولے ہوئے تھے۔ اس منظر میں خوبصورتی نہیں، ہیبت سی تھی، جو اُدی واسی عورتوں کی چھوٹی بڑی ٹولیوں کی آمدورفت سے دب جاتی تھی۔ درمیانی شگاف کے بالکل تلے میں ایک بڑا تالاب سا تھا۔ کیا اسی کو کنواں کہتے تھے یہ لوگ؟ "کیا یہ بارش کا پانی ہے؟"

"نہیں، تازہ۔ برسات کا پانی تو مٹّی میں پڑ کر دھتیلا ہو جاتا ہے بائی۔ پینے جیسا نہیں رہتا۔ اِدھر کی مٹی میں دھات ہے دھات۔ لوہا۔"

یہ لوہے کے پہاڑ ہیں! ما نے گرتے پڑتے سوچا۔ اس بنجر زمین سے روزی اینچتے یہ لوہے کے لوگ؟ اس نے خیال کیا۔ اور پھر اسے کچھ باتیں یاد آئیں۔

نسروانجی کے فورمین نے انہیں بلایا تھا۔ ژیرچیتیا۔ اور کون تھا؟ آٹھ دس دوسرے، بائی۔ مٹی کو روند کر نرم کرنے کے لیے۔ پانی پینے بھی نہیں جانے دیتا تھا۔ حرامزادے، گھر سے پانی پی کر کیوں نہیں آتے؟ سورج ڈوبنے لگا۔ بیل کھیتوں سے نکل گئے۔ پکڑ پکڑ کر لا رہے تھے۔ ژیر نے کہا؛ کیسے رکھیں انہیں اس زمین پر؟ کانٹے ہیں۔ بہت کانٹے ہیں یہاں۔ کھاتےدار کے مہتا نے سن لیا۔ ژیر کو ہل سے جوت دیا بائی۔ ژیر تو بالکل سوکھا تھا۔ ہل کا بھار! نہیں چل سکا۔ مہتا نے بھالے سے چھید دیا۔ رکت ہی رکت اُبل رہا تھا۔ ژیر نے دو بار پورے کھیت کا چکّر لگایا۔ رکت مٹی میں مل گیا سارو۔ لال ہی لال ہو رہا تھا کھیت۔

کندھوں پر پیڑ رکھ کر دبا دیتے تھے۔ دو آدمی دونوں کندھوں سے لٹک جاتے۔ جھولنے لگتے۔ ورلی گر جاتا۔ سب کچھ مان جاتا۔

جانو کو زندہ گاڑ دیا تھا۔ جانو کے بھائی کی عورت پر آنکھ تھی۔ کھاتےدار کے آدمی لینے آئے تھے۔ جانو کوٹھری میں نہیں تھا۔ عورت نے جانے کی مرضی نہ دکھائی۔ بال سے پکڑ کر گھسیٹنے لگے۔ شور سے سب واسی گھروں سے نکل آئے۔ آگ کی روشنی میں دیکھ رہے تھے۔ چپ چاپ۔ اسے لے گئے۔ ہم تو سر جھکا کر روتے ہوئے اپنے اپنے جھونپڑوں میں آ گئے۔ دوسرے دن اس کا آدمی لوٹا۔ اس کی عورت کہاں گئی؟ اس نے کاربھاریوں کو بلایا۔ بستی کے بڈھوں کو۔ کھاتےداروں نے گڑھا کھودا۔ آدمی کو زندہ گاڑا۔ سب کے سامنے۔ جانو بچ گیا۔ جانو اور اس کی بھابی بستی سے بھاگ گئے تھے۔ کھاتےدار کہتا تھا۔ کسی نے ایک لفظ بھی کہا تو ٹانگ اور بازو کاٹ لیں گے۔ پھر بھی بات نکل گئی۔ انگریز کا زمانہ تھا بائی۔ اسپتال کے ڈاکٹر آئے۔ پولیس آئی۔ گڑھا کھود کر بڈیاں نکالیں۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا؛ جانور کے ہاڑ ہیں۔ کھاتےدار کو کون کچھ کہتا؟

ورلیوں کو کھیت پر مار۔ معاملت دار اور تلاٹھی ان کے اپنے تھے۔ مہتا سخت گیر۔ کہیں سے لاتے تھے مہتا۔ اتر کے بھیے ہوتے تھے، اور پٹھان۔ شریف خان کا نام سن کر ورلی کا پیشاب نکل جاتا تھا۔ ہانک کر تھانے لے جاتے تھے۔ مہینوں بند پڑے رہتے۔ ان کی عورتیں دوسروں سے بچے کے ساتھ ہو جاتیں۔ ان کے بچے مر جاتے۔ بیمار ہو کر اور بھوکے رہ کر۔

کھاتےدار برجور کی زمینیں دھانوری گرام کے پاس تھیں۔ زمینیں کس کی تھیں۔ کون جانے؟ ورلیوں کی تھیں بائی۔ اکال پڑا تو آٹھ آٹھ آنے ایکڑ خرید لی تھیں کھاتےداروں نے۔ پانچ سیر چاول پر پوری زمین خرید لی تھی بائی۔ کھاتوں میں دیکھ لو۔ پرانے کھاتوں میں سب لکھا ہے۔

برجور کی زمین پر معاملت دار سالوی ٹھیرتا تھا۔ دوسرے وردی والوں کے ساتھ۔ برجور سیٹھ کے گھر ورلیوں کو بلایا گیا۔ تمہارے پاس بندوق ہے؟ انہوں نے پوچھا۔ ورلی بندوق نہیں جانتے تھے۔ ہی فوج میں جو گئے تھے، ان کے پاس ہو گی۔ وہ یہاں کہاں تھے؟ وہ ننھو گھراٹ کو گھیر کر لے گئے۔ ننھو کو مرغا بنایا۔ اس کی لنگوٹی اتار لی۔ اس کی گانڈ پر مٹی کا تیل ڈال دیا۔ آگ لگا دی بائی۔ ننھو گھراٹ جانور جیسا رو رہا تھا۔ بھاگ رہا تھا چاروں طرف۔ ارے بندوق تو میرے دادا، پردادا، سکھڑ نکھڑدادا کے پاس بھی نہیں تھی۔ کہاں سے نکالوں؟ وہ آدھ موا ہو کر گر گیا۔ رات بھر ننھو گھراٹ وہیں پڑا رہا۔ برجور سیٹھ معاملت دار سے کہہ رہا تھا؛ ٹھیک مار نہیں دی! اس کی گانڈ میں ڈنڈا ڈال کر ذرا ٹھونکتے، ایک چھوڑ دو بندوقیں نکل پڑتیں۔

سچی بات بتاؤں بائی؟ چھوٹے وردی والے تک منھ چھپا چھپا کر رو رہے تھے، جب وہ اس کی آدھ موئی جان کو اس کی جھونپڑی کے سامنے پھینکنے لائے۔ ہے بھگوان! ان لوگوں کو چھما کیسے ملے گی؟

ہے بھگوان!

آشا کے باپ ہے۔ بڈھے ورلی نے پانچ جماعت تک پڑھا تھا۔ کیسے پڑھا تھا؟ یہ ما کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اور وہ کسی گوداوری مائی کا نام لیتا جاتا تھا۔

گوداوری، جو ما کے علم کے مطابق ایک ندی ہے۔ "کون تھی یہ گوداوری مائی؟"

"میں نے اس کو دیکھا تھا،" ورلی نے کانکھتے ہوے کہا۔ اس کی پوپلی باچھیں کھل گئیں۔ "دیکھا کیا، ہمارے ساتھ رہی تھی رات بھر۔ رات بھر رہی تھی گوداوری مائی--- یہیں تو گھومتی پھرتی تھی، سانجھ سویرے، یہ لمبی لاٹھی ٹیکتی۔"

"بڈھی تھی؟" ما نے پوچھا۔

"ارے نہیں۔ وہ تو پہاڑ پر چڑھنے اترنے کے لیے۔"

"آشا ابھی نہیں جنمی تھی۔ ایک سانجھ پڑے اسے بھگوان نے بھیجا۔" ورلی نے اوپر اشارہ کیا۔ "بھگوان نے بھیجا مائی کو۔ گوداوری مائی۔" وہ کوٹھری کی زمین کو بوسے دینے لگا۔

آشا کے باپ کا نام وٹھو تھا۔ کوئی گوداوری مائی برسوں پہلے اس کی جھونپڑی میں آئی تھی۔ اور اسے اب بھی کچھ کچھ یاد تھا۔ اس کے آنے سے اجالا ہو گیا تھا۔

ایک شام:

جنگل کے کنارے کنارے، وہ عورت نوگزی مراٹھا ساری لپیٹے، لمبی لاٹھی تھامے گھوم رہی تھی۔ ایک ننھے چرواہے نے اسے رات بتانے کے لیے پہاڑی پر جانے کو کہا تھا۔ لاٹھی کے سہارے وہ ڈھلان پر چڑھتی جگ پتھریوں میں کوئی جگ ڈھونڈ رہی تھی۔ تیرہ چودہ سال کے ایک ننگ دھڑنگ لڑکے نے اسے بتایا تھا: "میری بستی پاس ہے۔" عورت اس کے گھر رات رہنے کے لیے چل پڑی تھی۔

پہاڑی سے نیچے اترتے اترتے اندھیرا چھا گیا۔

وہاں ایک چھوٹی، آدی واسی بستی تھی۔ چھوٹی چھوٹی، نیچی چھت والی، بانس اور پھُوس کی جھونپڑیوں میں آگیں روشن ہو گئی تھیں۔ وٹھو کی جھونپڑی میں ہلچل مچ گئی۔ بڑا لڑکا کہیں سے کھٹولی لانے بھاگ گیا؛ چھوٹا لڑکا وٹھو کو بتانے۔ وٹھو گھر پر نہیں تھا۔ لڑکا کھٹولی لے آیا تو بائی نے کھیس بچھائی اور بیٹھ گئی۔ وٹھو جھونپڑی پہنچا تو سلام کرنے کے لیے زمین پر لیٹ گیا۔

"اٹھو اٹھو!" گوداوری مائی نے کہا۔

وٹھو کی عورت اور بچے اسے کیا کھلائیں؟ پریشانی سے وٹھو کی عورت کے پیٹ میں درد

ہونے لگا تھا۔ اندھیرا پڑ گیا۔ اس وقت کہاں سے کچھ ملے گا؟

گوداوری مائی کو پتا چل گیا۔ کیسے پتا چل گیا؟ کسی نے اس سے کچھ نہ کہا تھا۔ وہ تو آپس میں کھس پھس کر رہے تھے۔ "جو بھی گھر میں ہے وہی کھاؤں گی۔"

"تمھیں بھگوان نے بھیجا ہے بائی۔ تم خود بھگوان ہو بائی گوداوری،" وٹھو کربٹ تتلایا اور رو پڑا۔ یہ چھوٹا سا کنبہ مصیبت میں تھا۔ فصل کا پورا حصّہ کھاتےدار کو بھجوا چکا تھا۔ لیکن اس کو لالچ تھی۔ دو روز پہلے اس کے آدمی تلاتھی کے ساتھ گھر سے چال کا ایک ایک دانہ لے گئے تھے۔ پھر بھی وہ سمجھتے تھے کہ چاول وٹھو نے کہیں چھپا دیے ہیں۔ دھمکی دے کر گئے تھے۔ تین روز میں پورا حصّہ نہ ملا تو گھر کے برتن بھانڈے، چھت کے شہتیر، بانس، عورت کے کپڑے، چاندی کے کڑے، سب کچھ لے جائیں گے۔ ہل کی پھالی اور گھڑے گھڑولیاں تک لے جانے کو کہتے تھے۔ وٹھو کربٹ بستی کے آدی واسی پنچوں کے پاس گیا تھا۔ پنچ کیا کرتے؟ کھاتےدار کا معاملہ!

"چاول کے ساتھ پتّے ابال کر کھلائے مائی کو۔ کھٹّے پتّے۔ بھورے چاول۔ اگل اگل کر کھایا مائی نے۔ کھٹا چاول کھایا نہیں جا رہا تھا۔ سارا کا سارا ہاتھ جوڑ کر لوٹایا۔ کافی بھوک نہیں لگی تھی مائی کو شاید۔ بچوں کو دینے کو بولی تھی۔ بچوں کے لیے تو آمبلی تھی نا بائی۔ بُھورے چاول کا پیج، تھوڑی پیاز کے ساتھ۔ وہ ہی آمبلی کھا کھا کر یہ اشا بڑی ہوئی۔"

"پھر کیا ہوا؟"

پھر نہ جانے کیا ہوا۔ نوّے پچانوے برس کے بڈھے وٹھو کربٹ کے بیان میں یہاں الجھاوا تھا۔ بستی کے سارے آدی واسی جمع ہو گئے تھے۔ بہت بڑی آگ جلائی گئی تھی۔ (کیا یجنا؟ ما نے سوچا تھا۔) وٹھو کربٹ کو کھانے پینے کی چیزیں لانے، چرائے جانے، چھینے جانے کی تفصیلات اچھی طرح یاد نہیں، اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن کچھ ہوا ضرور تھا۔

ما نے نظر اٹھا کر بھورے آسمان کو دیکھا۔ چاروں طرف سرخ پہاڑ اپنی دراڑوں کے منھ پھاڑے کھڑے تھے۔ ان کی ڈھلانوں سے یہ مقام اب کسی سرخ پیالے کے تلے کی طرح تھا، جس پر آسمان کا بھورا سرپوش ڈھکا ہو۔ سرخ پیالے کو بدرنگ آسمان نے ڈھانپ دیا تھا۔

دونوں عورتیں لال پتھروں سے ابلتے، لال ہی نظر آتے پانی سے کپڑے دھوتی رہیں۔ کتنا ٹھنڈا پانی! دھرتی کی جانو کوکھ سے نکلتا ہوا۔

"ہے پتالیسورا" اشا نے کہا۔ تھوڑا غور کرنے پر ما سمجھی۔ پاتال کا ایشور۔ یہ سب -- الگ الگ کیوں ہیں ان کے دلوں میں؟ اس نے غور کرنا چاہا۔ آکاش کا ایشور، اور پاتال کا؟

سرخ مٹی نے تمام کپڑوں کو ایک ہلکے گلابی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ نائلون کے صابن کی بٹّی یہ رنگ اتارنے میں ناکام تھی۔ جسے مَل مَل کر، مکّیاں مار مار کر وہ کپڑے دھو رہی تھیں -- چُھواچُھو، چُھواچُھو۔ پانی کے چھینٹے اڑ اڑ کر ان کے منھ پر پڑ رہے تھے۔ ما نے یاد کیا -- کوئی پرانا گیت۔

ندی کنارے مَیں کھڑی اور پانی جھل مِل ہوئے
میں مَیلی پیا اُجلے ری، مرا کس بدھ ملنا ہوئے

یہ کپڑے بھٹی پر چڑھے بغیر صاف نہیں ہوں گے۔ زنگیایا رنگ ہے، ما نے سوچا۔

تب ہی اس کی نظر اپنے پیروں پر پڑی۔ سرخ کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے اس کے پیر۔ اب جو اس نے اپنے پورے تن پر نظر ڈالی تو اسے احساس ہوا۔ پہاڑی سے اترتے پھسلتے جو مٹی اس کے تن بدن پر تہہ بنا گئی تھی، اب کپڑے دھوتے ہوئے سرخ کیچڑ بن چکی تھی، جو جگہ جگہ سوکھ رہی تھی، یاخدا! اب وہ کیا کرے۔ اس نے اُشا کی طرف دیکھا جو سوکھی ساکھی بیٹھی تھی پتھر کے ایک بڑے چوکور، چبوترے جیسے ٹکڑے پر۔ نہ وہ پھسلی تھی، نہ مٹی میں لوٹی تھی۔ اور اسے کپڑے دھونے بھی اپنےآپ کو شرابور کیے بغیر آتے تھے۔

"دیکھو میں تو بھوتنی بن گئی،" ما نے کہا۔

دو شانت آنکھوں نے اس کا جائزہ لیا۔

"آپ نہا لیجیے۔ سنان کر لیجیے۔"

"مگر یہاں؟"

ما نے گھبراہٹ میں اِس پاس نظر دوڑائی۔ ہر طرف مقامی لوگ تھے۔ عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ کچھ انھی کی طرح کپڑے دھو رہی تھیں۔ اور پاس ہی لنگوٹی کسے یہ ڈھیر مرد لوگ۔ کھدائی کر رہے تھے کسی قسم کی۔

اُشا نے اس کی بےبسی کو سمجھا۔

"یہاں ایک جگہ اور بھی ہے۔ پن تھوڑی دور---"

دھوئے ہوئے کپڑوں کو، جو اب پہلے سے دُونے بھاری ہو چکے تھے، بالٹیوں میں بھر کر، انھیں اپنے سروں پر لاد کر، وہ اس دوسری جگہ کی طرف چل دیں۔ اسی گھڑی پہاڑوں سے بھدر بھدر بندروں کی طرح کودتے، جینز اور پتلونیں گھٹنوں تک اڑسے، بیسیوں جوان لڑکے پہاڑی سے اترتے پھسلتے ان پر نازل ہوئے۔ یہ سب سیاح تھے۔ اپنی ولا سے نیچائی میں ما اور اس کے کنبے نے انھیں دیکھا تھا۔ آل انڈیا ٹورسٹ کارپوریشن کے بدحال خیموں میں ٹھہرے ہوئے مراٹھا طالبعلم۔ چیختے اور گاتے ہوئے۔ کھجاتے ہوئے۔ منہ پر مہاسوں کی بھرمار۔ ایک سے ایک جوکر لگ رہا تھا۔ کسی نے بدھنا اٹھا رکھا تھا کسی نے بالٹی - یہ سب پانی کی تلاش میں آئے تھے۔ ما کی ہنسی چھوٹ گئی۔ لڑکے کیسے ہو جاتے ہیں جوان ہوتے ہوئے، ما نے ہنسی بھرے افسوس کے ساتھ سوچا۔ اس کا چیکو بھی ایسا ہی ہو جائے گا ایک دن ؟ یہ غریب گھروں کے لڑکے تھے۔ پتلی گردنوں میں نرخرے اوپر نیچے ہو رہے تھے سب کے۔ نوجوانی کی حیوانی چکلاہٹ نے غریبی امیری برابر کر دی تھی ان کے لیے۔ اسی بھیڑ میں اسے صاف وہ لڑکا نظر آیا؛ وہی جو اس پر برسا تھا۔ کیچڑ میں لپٹی ما جم کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اس لڑکے سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔

اُشا کنارے لگی چپ چاپ کھڑی رہی۔ کپڑوں کی جستی بالٹیاں اس نے نیچے رکھ دیں۔

"اس دن۔۔۔ اس دن۔۔۔ تم نے اتنا غصّہ کیا۔ میں تو ایسا کچھ نہیں چاہتی تھی۔ مجھے مراٹھوں سے کیا لینا دینا! مجھے تو تمھارا یہ پردیش اور تم سب لوگ۔۔۔ بہت ہی اچھے لگتے ہو۔"

اس نے انگریزی میں کہا۔

گہرا سانولا مراٹھی، کچھ گھبرا کر، لیکن کچھ خوش ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ اتنے سارے ساتھیوں میں ایک اس کے ساتھ ایک عورت باتیں کر رہی ہے۔ اور وہ بھی انگریزی میں۔ اس کے ساتھی اشتیاق سے کھسک کر ان کے گرد حلقہ بنانے لگے۔ لڑکے نے انھیں ڈانٹ کر بھگا دیا۔

"آپ اِدھر کی لگتیں نہیں میڈم؟" اس نے کہا۔ "آپ بمبئی کی نہیں کیا؟" اس نے اپنی جتّاتی انگریزی میں سوال کیا۔

"میں۔۔۔ میں؟" ما چکرائی۔ پھر اس نے بہت سنبھل کر کہا، "میں تو انڈین ہی نہیں ہوں۔" اور یہ الفاظ اس نے جتنی مشکل سے کہے تھے شاید زندگی میں کوئی الفاظ اس کے منھ میں اس طرح ریت کی پھنکی ہو کر نہیں بھرے تھے۔

مراٹھے نے کیچڑ میں لتھی عورت کو حیرت سے دیکھا۔

"ناٹ انڈین؟ آپ کون ہیں؟"

"پاکستانی،" ما نے کہا۔ لڑکے کا رنگ فق ہو گیا۔ پسینے چھوٹ گئے لڑکے کے! پاکستانی؟ یہاں؟

"سنو سنو!" ما نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "گھبراؤ نہیں۔۔۔ میں یہاں۔۔۔ ہم یہاں۔۔۔ انڈین حکومت کے علم میں ٹھہرے ہیں۔ پناہ لی ہے ہم نے۔۔۔ ایک طرح کی۔۔۔"

لڑکے کی حالت اور بھی زار ہو گئی۔ یہ کس چکر میں پھنس رہا تھا وہ؟ یہ سب کیا تھا؟

گز بھر کے فاصلے پر کھڑے دوسرے لڑکوں نے کان کھڑے کر لیے۔ گردنیں شترمرغوں کی طرح لمبی کر کے وہ سننے کی کوشش کرنے لگے۔

ما کا دل ڈوب گیا۔ لیکن وہ آخر ایک پختہ عمر کی عورت تھی۔

"ہم یہاں سے بمبئی جائیں گے،" اس نے کہا۔ "میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔۔۔"

لڑکے کی سیاہ آنکھیں اسے پوری توجہ سے دیکھ رہی تھیں۔

"تمھارا پتا؟ اچھا۔۔۔ تم اپنا پتا شاید دینا نہ چاہو۔ میرا پتا لے لو۔"

لیکن وہاں نہ کاغذ تھا نہ قلم۔ پھر ما نے ایک ایسا کام کیا جس کو سوچ کر بھی وہ حیران ہوتی رہی۔ اس نے مصنوعی ہنسی ہنس کر سرخ پتھر کا ٹکڑا اٹھایا اور انیس بیس برس کے مراٹھے لڑکے کی قمیص پر بمبئی کا پتا لکھ دیا۔

ما کی انگلیاں لڑکے کی پسلیوں سے مس ہوئیں۔ ما کا دل کٹ گیا۔ نکلی ہوئی پسلیاں۔

لڑکا بے خوف، کالی آنکھوں سے ما کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کہا،

"میں شوسینا کا سولجر ہوں۔"

ما چونک گئی۔ ہاں پھر کو اس کے ہاتھ ٹھٹک گئے ارے، اس نے پہلے کیوں نہ سوچا تھا۔ یہ تو یہ۔۔۔ یہ کوئی عام سا لڑکا نہیں تھا۔ جس طرح وہ سا متعارف، بازار میں اس دن پھوٹ پڑا تھا۔

عام لڑکے ایسا کہاں کرتے ہیں؟ کتنے شرمیلے ہوتے ہیں اس عمر کے لڑکے! لیکن وہ ایک ادھڑوٹ تھی، اور عورت تھی، اس لیے ایک مذہبی جنونی پارٹی کا رکن ہونے کے انکشاف نے ما پر بس چند سیکنڈ کے لیے اثر کیا۔

"میں آپ کے بارے میں پتا کروں گا،" اس نے ٹھوڑی سینے سے چپکا کر پتا دیکھنے کی کوشش کرتے ہوے کہا۔

"اچھا؟" ما پھیکی ہنسی ہنسی۔ اس نے دھلے کپڑوں کی بالٹی اٹھالی۔ "کر لینا پتا۔" اس نے لڑکے کے سراپا پر پیچھے ہٹ کر نظر ڈالی؛ دبلا چھریرا، پھرتیلا، سانولا، جس کی چتون سے ذہانت اور بےخوفی ٹپک رہی تھی۔ کیسا تھا یہ؟ سواجی مرہٹہ جیسا؟ گھوڑے کی پیٹھ پر کیسا لگے؟ جیسے دبلے بدن میں پارہ بھرا ہو! لیکن... اسے خیال آیا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر تو نہیں تھا یہ۔ گھوڑے پر تو رمیش تھا۔ گجراتی سرمایہ دار کا بیٹا۔ یہ تو پیدل تھا۔ پیدل بھکڑ۔ ما دل میں زہر بھری ہنسی ہنسنے لگی۔ شو سینا کا سینک! "تمھارا نام کیا ہے؟" ما نے جاتے جاتے مڑ کر پوچھا اور "سواجی" سننے کی توقع کی۔

"دھرمانند،" لڑکے نے کہا۔ پھر اپنے گروہ میں ملنے سے پہلے اس نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا، "گڈبائے، آنٹی۔"

آنٹی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ دور ہوتا گیا... تال کے کنارے تک پہنچ گیا۔ ما نے دور تک فرقہ واریت کے سدا روشن الاؤ کے اس انسانی ایندھن کو دیکھا۔

دونوں عورتیں اپنا بوجھ ڈھوتی، بے برگ و گیاہ پتھریلی پہاڑی کا موڑ کاٹنے لگیں۔

انھیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ تھوڑے سے ہی فاصلے پر سرخ، اوبڑکھابڑ دھرتی پر، ما کو کچھ برا برا نظر آیا۔

"وہ ہے۔" آشا نے اسی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

کائی تھی۔ کسی پرانے تالاب یا حوض پر جمی ہوئی کائی۔

دو ڈگ بھر کر وہ اس کے کنارے پہنچ چکی تھی۔ ما کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ کتنی بھی کٹھور ہو، اس پانی سے زیادہ تو کٹھور نہ تھی!

"نہاؤں؟ میں؟"

اس نے جیسے اپنےآپ سے پوچھا۔

آشا نے جست کی بالٹی زمین پر رکھ دی۔ پھرتی سے وہ ایک بالٹی کے کپڑے سرخ چٹانوں پر پھیلانے لگی۔ بالٹی خالی کر کے اس نے کنارے پڑی ایک چھڑی سے پانی پر جمی کائی ہٹائی۔ اس کے نیچے کائی کے ہی رنگ کا سبز پانی تھا۔

ما کے پیر میں اسی گھڑی جیسے کسی نے ایک تیز، لمبی سوئی گھونپ دی۔

چیخ مار کر ما نے پیر جھٹکا۔ وہ دیوانہ وار پیر جھاڑنے لگی۔ اس کی چٹکی میں ایک چیونٹا آ گیا۔ سرخ، بڑا سا چیونٹا!

ما نے گھبرا کر اسے دور پھینکا۔

اس کی پنڈلی کے پاس سوئی کی نوک کے برابر خون کا ذرہ ابھر آیا تھا۔

"یا اللہ!" اس نے کہا۔ " یہ کہاں سے آ گیا؟" اچانک اسے یاد آیا۔ ایک بہت پرانی بات، کبھی بچپن میں اس کی ماں نے کہی تھی اس سے۔ "اللہ تعالیٰ نے رزق کا وعدہ کیا ہے۔ وہ کیڑے کو پتھر میں رزق دے دیتا ہے۔"

ما نے دور دور نظر دوڑائی اور تقریباً بےخیالی میں سوچا، کہاں دے دیتا ہے؟ دور دور رزق کا نام و نشان نہیں۔ یہ کیڑا یہاں کیوں آ گیا؟

اس کی نظروں نے چیونٹے کو ڈھونڈا۔ "خون کھینچ لیا کم بخت نے،" اس نے چیونٹے کو کوسا۔

اُشا خالی بالٹی میں پانی بھر رہی تھی۔ سروقد کھڑے ہو کر اس نے کہا،

"لو۔ کرو سنان۔ میں پانی ڈالتی ہوں۔"

ما کپڑے دھونے کا صابن مل مل کر اپنے سریر کی مٹّی اتارتی رہی۔ اشا نے پانی ڈال کر اسے نہلا دیا۔ ما ہلکی پھلکی ہو گئی۔ پانی تو آخر پانی تھا، چاہے کتنا ہی پرانا کیوں نہ ہو۔ سب کچھ دھو کر صاف کر دینے والا۔ ما بالکل تازہ دم ہو گئی۔

"ایک بار..." اُشا نے کہا، "یہاں نہائی تھی۔ گوداوری مائی۔" وہ ادھ سوکھے کپڑے جھاڑ کر واپس بالٹی میں رکھ رہی تھی۔ "باپ نے بتایا تھا۔"

ما کے دماغ میں ٹن سے کسی گوداوری کی تصویر آئی۔

"لیکن وہ یہاں کہاں؟" ما نے اپنی بالٹی اٹھا کر پوچھا۔ "وہ تو... ادھر، امبر گاؤں کی طرف تھی۔"

"وہاں بھی تھی۔" اشا نے اپنے سے کہا۔

سرخ درازوں پر جما جما کر قدم رکھتی وہ اوپر چڑھنے لگی تھیں۔ پہاڑی پر چڑھنا کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ما کو اب اُشا کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑ رہی تھی۔ اُشا کی بات پر وہ کچھ ہنس کر سوچ رہی تھی، یہ ایک تھی یا کئی عورتیں تھیں؟ شاید ایک سے زیادہ۔ شائد وہ کسی عسائی مشن کی نرس تھیں، ایک سی ساریاں باندھے۔ اگر وہ وٹھو کربٹ کے تخیل کی تخلیق نہ تھی۔

وٹھو کربٹ! ایک بھیانک خواب کی طرح وہ سب باتیں ما کے ذہن میں گھومیں۔ کس کی بیٹی تھی وہ؟ زیرجیتا کی، کہ کسی اور کی۔ ارے مائی تلاتھی نے یوں پکڑا۔ اونچا اٹھایا۔ یہ دے مارا۔ دھرتی پر۔ پھر اٹھایا۔ پھر دے مارا۔ دھپ! تیرے باپ کی بندوق کہاں؟ کہاں چھپائی؟ ارے کدھر ہے بندوق؟ ایک بار کہا۔ پھر بولے جیسی نہیں رہی۔ ترچھا لوہا اس کی --- میں گھسیڑنے کو کہہ رہے تھے۔ لڑکی رکت میں نہائی۔ بچی نہیں بعد میں وہ۔ سارا رکت تو وہیں رس گیا۔ مٹّی میں۔

ترائی کے گھنے بن اور ورلی!

یہ اکتوبر ۱۹۲۵ کا قصّہ ہے۔

تب ہی آس پاس کہیں ما اور با پیدا ہوئے تھے۔ کہیں بہت دور۔ دور دراز کے علاقے میں۔ گوداوری۔ جو چائے بہت پیتی تھی۔ چائے پیتی تھی مائی گھڑی گھڑی!

بچّوں کی کھل کھلاہٹ۔ کہاں سے لائیں گے چائے؟ ہاں ہاں، ہمیں آتی ہے بنانی۔ پہلے تو کہیں سے پتّی لاؤ۔ پتی آ گئی۔ اب چینی۔۔۔ چینی کہاں؟ گڑ بھی نہیں ہے۔ جاؤ جاؤ، گڑ لے کر آؤ۔ بانی گڑ کی چائے پیے گی؟ پی لے گی؟ ہاں ہاں، پی لے گی بھئی۔ خوشی سے۔ ہر طرح کی پی لے گی۔ بس چائے ہونی چاہیے۔ اب رہا دودھ۔ دودھ ورلی کے پاس کہاں؟ کسی ماں کا تھن نچوڑ لو تو دوسری بات ہے۔ کہیں سے دودھ خرید کر لانا پڑے گا۔ ایک لڑکا دوڑتا گیا۔ پات کے دُونے میں آدھے گھنٹے میں دودھ لایا۔ پتّی اور گڑ پانی میں کھول کھول کر تب تک کالے ہڑ چکے تھے۔ مگر دودھ ڈالنے سے اجلے ہو گئے۔ مائی نے ہنس کر چائے پی۔

نہیں وہ ایک ہی تھی۔ کئی تو نہیں ہو سکتیں۔ ایک ہی جیسی چائے کی شوقیں۔ ایک بالکل نرالی دیوی۔ چائے کی دیوی! ما نے دل میں سوچا۔ جب ہر چیز کے دیوی دیوتا ہو سکتے ہیں، تو چائے کا کیوں نہیں؟

اچانک ما کو خیال آیا۔ "جو آم کی پوجا کرتے ہیں، وہ گوت۔۔۔ آم کھاتی نہیں کیا؟" اس نے آشا سے پوچھا۔

"کھاتے کیوں نہیں۔ آم کا پیڑ نہیں کاٹتے۔" آشا نے رسان سے کہا۔

"ہوں" ما نے چڑھتے چڑھتے ہنکارا بھرا۔ اسے گائے کا خیال آیا۔ اسے شوسینا کا خیال آ رہا تھا۔ سواجی مرہٹے کا۔ بال گنگادھر تلک کا، جنھوں نے دیش کی رکھشا اور گائے کی رکھشا کا نعرہ دیا۔ تلک تک پہنچے پہنچے، وہ صرف مرہٹہ تحریک نہ رہ گئی تھی۔ پورے ہندوستان کی آزادی کی تحریک تھی۔ مگر گائےخور مسلمان اس تحریک سے بھی غائب! تلک نے ایسا نہ سوچا کیا؟ گائے کا سوال سامنے رکھنے سے مسلمان بدظن ہو جائیں گے؟ ان کا ہندوستان کا تصوّر کچھ اور تھا۔ کانگریس میں ۔۔ ما کو خیال آیا ۔۔ سب کے خیال الگ الگ تھے۔ نہرو کے کچھ اور، گاندھی کے کچھ اور، تلک اور پٹیل کے بالکل جدا۔۔۔ بس چند نکتوں پر متفق ہو کر وہ ایک ہی پارٹی میں تھے۔ اسے اسماعیل میرٹھی یاد آئے۔

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی

وہ دل ہی دل میں اپنے بھولے، خیرخواہ ہم وطن پر مسکرائی۔ تاسّف اور پیار سے۔ شاید سوچتے ہوں گے، اس طرح مسلمان بھی گائے سے پیار کرنے لگیں! کم از کم عزّت ہی کرنے لگیں۔ مسلمان گائے کو برا کہاں سمجھتے تھے؟ سب ہندو گائے سے پیار کہاں کرتے تھے؟ کتنے ہی ٹھیلے والوں کو، جن کی سبزی ترکاری میں کھلی چُھٹی پھرتی گائیں منھ مارتی تھیں، اس نے قمچیاں مار مار کے گایوں کو بھگاتے دیکھا تھا۔ اور بڑی عمارتوں کے سامنے (وہ یاد کر کے ہنس پڑی)

پھاٹکوں کے سامنے۔ زمین میں گڑھا کھود کر لوہے کے جال لگائے گئے تھے۔ یہ کاؤ ٹریپر کہلاتے۔ گایوں کے کھُر ان میں پھنس جاتے۔ وہ اندر جا کر چمن کا ناس نہ کر سکتیں۔

بات شاید گائے کی نہیں تھی۔ بات تو شاید کچھ اور تھی۔ اس نے سنا تھا، آزادی سے پہلے، بعض جگہوں پر بقرعید کے موقعے پر، گایوں کو خوب سا سجا کر، ہندوؤں کے علاقوں سے جان کر مسلمان مذبح کی سمت ہنکا لے جاتے۔ فساد بھی ضرور ہوتے۔ مگر پروا کس کو تھی؟ لوگ سر سے کفن باندھ کر جاتے تھے۔ کیا گائے کو ذبح کرنے کے شوق میں؟ ما نے افسوس سے سوچنے کی کوشش کی کہ لڑائی اصل میں کس بات پر ہوتی ہو گی۔ "تم ہمارے جذبات مجروح کرتے ہو، ہمارے منھ پر تھپڑ مارتے ہو!" ہندو سوچتے ہوں گے۔ خواہ مخواہ کی "اڑی" (بقول سندھیوں کے)۔ اگر ایک گائے نہ کاٹیں تو ان کے خدا ان سے ناراض تو نہیں ہو جائیں گے! ارے، اور بہت سے جانور ہیں قربانی کے لیے۔ بکری، بھیڑ، اونٹ!

مسلمان بیٹھے بٹھائے ہندوؤں کے جذبات مجروح کرنا نہیں چاہتے ہوں گے (ما نے قیاس دوڑایا)۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ وقت اور پیسا لگا کر دوسروں کے جذبات کو مجروح کرتا پھرے؟ شاید وہ کہنا چاہتے ہوں گے کہ تم ہمیں کسی بات کے لیے زبردستی مجبور نہیں کر سکتے۔ اصل میں (ما نے فیصلہ کیا) ہندو اور مسلمان--- ایک دوسرے کا اصل مقصد ٹھیک سے سمجھ نہیں سکے۔ (ما نے مشورہ کر لیے!) پھر اسے ایک عجیب سا خیال آیا، جیسے کوئی لطیفہ ہو۔ اصل مقصد سمجھ جاتے تب شاید اور بھی لڑتے۔ آخر ایک قوم کا دوسری قوم کی طرف، ایک جاتی کا دوسری جاتی کی طرف، ایک آدمی کا دوسرے آدمی کی طرف، اصل مقصد ہے کیا؟

کہا جائے کیا؟ ما نے ہیبت سے سوچا۔ اپنے اندر دوسرے کو مٹا ڈالنا؟ زیر کر لینا؟ شاید ایسی شعوری خواہش نہ ہو یہ۔ لیکن پھر بھی، کبھی کبھی--- یوں ہی تو لگتا تھا۔ جیو کا کوئی لامحسوس انال! کو ایسا ہو یہ نہیں تھا شاید۔ "یا تُو نہیں، یا میں نہیں!" اس منھ زور بہاؤ پر کوئی بندھ تھا کیا؟ تُو بھی رہ جاتا اور میں بھی -- جنگ یا انسیت دونوں ہی قسم کے اتصال میں، ٹکراؤ میں۔

اسے پھر آدی واسیوں کا خیال آیا۔ ناگ پوجا کرتے تھے یہ۔ وہ ناگ کہاں گیا؟ دراوڑی دیوتا، شوجی کے گلے سے جا لپٹا۔ اس طرح وہ اپنے نئے (دراوڑوں کے پرانے) دیوتا کو ماتھا ٹیکتے ہوئے اپنے پرانے (دراوڑوں کے نئے) ناگ دیوتا کو بھی ماتھا ٹیک لیتے تھے۔ ان کی پوجا آپس میں گھل مل گئی۔ مل کر ایک ہو گئی، لیکن کثرت اور ضرب در ضرب کے جنّاتی عمل سے، وہ ایک ہونے کے ساتھ دو بھی رہی۔ گلے میں ناگ لپٹائے شوجی کو ماتھا ٹیکنے کے بعد، ادھر اُدھر دیکھ کر لوگ چپ چپاتے اپنے پرانے ناگ دیوتا کی۔ اس کی اصل، اکیلی صورت میں، پوجا بھی کر لیتے۔ اس طرح دیوتاؤں کی بھرمار ہوتی گئی۔ "کوئی شے کبھی ختم ہوتی نہیں،" بعد میں باہمنوں نے نتیجہ نکالا، "بس روپ بدل لیتی ہے۔" اور روپ بدل کر پہلے جیسے بھی رہ جاتی ہے! ما نے حیرت کی۔ اور باہمنوں نے ایسا مشاہدہ کیا -- کتنی صدیوں پہلے! نہایت محنتی اور ذہین لوگ تھے، ما کے دل نے بےساختہ خراج تحسین پیش کیا۔ یہ باہمن، جو دوسری جاتیوں سے بڑھ کر

تو ذہین نہ ہوں گے، لیکن اب ان کا پیشہ ہی سوچنا ٹھہرا تھا، تو اسی میں لگ گئے ہوں گے۔ اور جن کی کسی سنتان کو اگے چل کر، وقت کی گھپ اندھیری کوکھ میں چکراتے ہوئے، صدیوں بعد، کسی تبدیلی سے گزر کر، شاعر مشرق علامہ اقبال بننا تھا اور اپنے پُرشور کلام کے بہاؤ سے پورے برصغیر کے ہم مذہبوں میں -- ایرانیوں، عربوں، افغانوں کی اولادوں، اور آدی واسیوں سے بنے اور بابمن اور کھشتری اور چوڑےچمار، اور ان سے مسلمان بنے کروڑوں لوگوں میں -- ایک نئی روح پھونکنی تھی اور گنگاکنارے، الہ آباد میں مطالبۂ پاکستان پیش کرنا تھا۔

000

ولا کی رات کا اندھیرا۔ جامنی اندھیرا۔ موٹے ریشم کا سا۔ مخمل جیسا۔

اور سواجی ٹنکی والا نہیں تھا!

ما تھکی ہوئی۔ چیکو سوتا ہوا۔ ککلی اور بڑکی اپنے اپنے بستروں میں۔ کوئی سپنے دیکھتی ہوئی۔ ما کا دل پُرسکون تھا۔

اور بستر میں ما! اور بستر میں با!

اس نے کہیں پڑھا تھا۔ ایک عورت کا قصہ، جس نے اپنے آدمی کو بےوفائی سے روکنے کے لیے، رات کو اس کے اور اپنے کپڑوں میں چپکے سے پن لگا دیا تھا۔ سیفٹی پن۔ رات کو جب آدمی اٹھا تو اس کی عورت کا دامن کھنچا۔ وہ بھی جاگ پڑی۔

با کروٹیں بدل رہا تھا۔ پھر اس نے پست کی اور سونے کی اداکاری کرنے لگا۔

ما کروٹیں بدلتی رہی۔ اس کے پاس تو کوئی پن نہ تھا۔ اگر ہوتا بھی تو... شرم کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر پاتی۔ اس کے ذہن میں ہر خیال دھندلا گیا۔ کسی تال کے ساکن، شفاف پانی میں ڈوبنے لگی ما۔ اس کے بال، ابی بیلوں جیسے تیرنے لگے۔ نیچے، اور نیچے، پُرسکون پانیوں میں، جہاں اس کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ جہاں آرام تھا۔ اتھاہ آرام ۔ نیند کے تال میں ڈوبتے ڈوبتے، بےحد ہلکے پانی سے اپنا حیرت انگیز طور پر بھاری پڑا ہاتھ نکال کر ما نے ایک بڑا سا، چمک دار، نُقرئی پن، با کے کپڑوں میں لگا دیا۔ ما سو گئی۔ نگ داری کرنے کے بدلے سو گئی ما!

دوسری صبح، کچھ بھی کل رات جیسا نہیں رہا تھا۔

بھیونڈی کے فسادات ختم نہیں ہوئے تھے۔ ایک دن کے وقفے کے بعد اور بھی شدت سے بھڑک اٹھے تھے۔ ایک کے بعد دوسرے قصبے میں وارداتیں ہو رہی تھیں۔

اور وجہ؟

وجہ کیا تھی؟ وجہ تو شاید کچھ بھی نہ ہو۔ بال ٹھاکرے کی تحریک کے شاخسانے۔ شوسینا، جو پچھلے ایک دو برس سے بمبئی کی، مہاراشٹر کی غریب بستیوں میں جنگل کی آگ

کی طرح پھیل گئی تھی۔ یہ ہندو تحریک تھی۔ مگر بال گنگادھر تلک کی کل ہند تحریک نہیں؛ ایک بار پھر، مراٹھا ہندو تحریک!

بال ٹھاکرے کو تو کوئی سنجیدگی سے لیتا تک نہ تھا۔ کم سے کم دلّی میں ما اور با کے پڑھے لکھے ہندو دوست تو نہیں۔ ایک ناکام کارٹونسٹ، جو بہت عرصے سے ایک اتنا ہی ناکام سیاست داں تھا۔ لیکن تھا مسخرہ، اور پُرلطف بیان دیتا، جس پر سب ایک دو دن ہنس کر بھول بھال جاتے۔

کیا جادو تھا اس کے پیغام میں؟ جس نے اندھیری، غلیظ چالوں سے کھینچ کھینچ کر لڑکے نکال لیے تھے۔ اس نیم خواندہ سیاسی شعبدہ باز میں؟

عجیب بات یہ تھی کہ ایک ڈیڑھ برس پہلے شوسینا نے بمبئی کی اسلامی جماعتوں کے ساتھ مل کر کچھ تقریبات کی تھیں۔ بار بھول پہنائے تھے ایک دوسرے کو۔ ان دونوں جماعتوں میں قدر مشترک کانگریس کی مخالفت تھی۔

بال ٹھاکرے اپنے آپ کو سواجی مرہٹہ کا جانشین سمجھتا تھا۔ شاید تھا بھی۔ وقت کی دھند میں ملفوف تاریخ کے رومانی ہیرو اصل میں کیسے تھے، کون جانتا ہے؟ شاید ہم جیسے ہی تھے۔

لیکن اب کی بار مسند گانے کا نہ تھا۔ گن پتی کے تہوار کا تھا۔

"گن پتی گپّا گوریا!"

ما نے اور اس کے کنبے نے بمبئی میں رنگ برنگے، ہاتھی، گھوڑوں، پالکیوں کے جلوس میں گنیش جی کو جاتے دیکھا تھا۔ گنیش۔ جنھیں سارے وید منھ زبانی یاد تھے! اور جو اتنے ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ پیٹو بھی بہت تھے۔ ایک بار کسی دیوتا نے دعوت کی تو اس کی میز کرسیاں، پیتیں تک کھا گئے۔ کیونکہ ان کے اندر سب کچھ سما سکتا تھا۔ تمام خیالات اور تمام اشیائے خوردونوش۔ گنیش جو برصغیر کے قدیم انسانوں کے کوئی دیوتا تھے، اور جنھوں نے ہزاروں برسوں کے طویل اور سدا بروبارہ اختلاط کے عمل میں مار بھگائے جانے سے انکار کر کے دراوڑی دیوی پاربتی کے گھر جنم لے لیا تھا، اور یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو گیا تھا۔ پہلے اُن کا سر ہاتھی کا نہ تھا۔ پر ایک بار ان کی ماں نہانے بیٹھی تھی۔ "کسی کو اندر نہ آنے دینا،" اس نے اپنی سنتان سے کہا۔ تب ہی وہاں شوجی پہنچے۔ لیکن گنیش انھیں کہاں اندر جانے دیتے!

"نہیں، ماں نے منع کیا ہے۔"

وہ شوجی کی قمیص سے لٹک گئے ہوں گے!

اب شوجی کوئی بڑکی تو نہ تھے کہ لنگوروں بھرے جامنوں کے پیڑوں کے نیچے پیر پٹک پٹک کر ٹہلتے؛ پاربتی جی کے نہا کر، ساری لپیٹ کر، بال سکھاتے باہر آنے کا انتظار کرتے۔ گھما کر انھوں نے جو کلہاڑی کا ہاتھ دیا تو گنیش جی کا سر تن سے جدا ہو کر۔۔۔ کہاں گیا؟ غرض غائب ہو گیا۔ یا آکاش میں کہیں چلا گیا۔ پاربتی جی باہر نکلیں تو بیٹا سر کے بنا پایا۔ "میرے بیٹے کے دھڑ پر سر لگا۔" انھوں نے شوجی کو جھنجھوڑ ڈالا۔ خون بھرے آنسوؤں کی برسات کر دی۔ شوجی سوچ میں پڑ گئے۔ ٹھوڑی سہلانے لگے۔ اب کیا کریں؟ وہیں سے جھومتا جھامتا ایک

سُندر سا ہاتھی آ رہا تھا۔ شوجی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ اس کا سر کاٹ کر گنیش جی کے دھڑ سے لگا دیا۔ "یہ سنبھالو اپنا پورن بیٹا!" انھوں نے گنیش جی کو ماتا پاربتی کے حوالے کیا، اور خود جامنوں کے جھنڈ کی اور چل دیے جہاں لنگور دانت نکالے ہنس رہے تھے۔ منھ چڑا رہے تھے شوجی کا۔ کئی شتابدیوں تک وہ وہاں پیر پٹک پٹک کر ٹہلا کیے۔ عورت جاتی پر لعنتیں بھیجتے۔ اُفوہ! تریاہٹ!

لیکن اس تریاہٹ کی جیت تو ہونی تھی۔ اور تہذیب کے رحم کی کلبلاہٹ سے گنیش جی کو جنم تو لینا تھا۔ اور اب ان کے تہوار پر خون خرابا!

کون بھلا یہ چاہتا ہو گا؟ کس کی خواہش ہو سکتی تھی کہ مراٹھے غریب غربا کا یہ خوشیاں منانا، خوشیوں کا شور اٹھانا جلوس سکاموں کی نذر ہو جائے؛ ان کے مٹھائیوں کے دونوں میں دُھول جا پڑے؛ ان کے رنگ دار برف کے گولوں میں، جنھیں ان کے بچے پچاس پیسے میں خرید کر چوس رہے ہیں اور "گن پتی گپّا گوریا" گا رہے ہیں، خون کے چھینٹے جا پڑیں؛ اور ان کاغذی محلوں کو عرب ساگر میں تعزیوں کی طرح ٹھنڈا نہ ہونے دے!

لیکن اصل بات تو یہ نہیں تھی۔ اصل بات کیا تھی؟

کچھ دنوں پہلے، بمبئی کے ایک اردو اخبار میں یہ خبر چھپی تھی کہ بال ٹھاکرے نے کسی جلسے میں مسلمانوں کی دلآزاری کے کلمات کہے ہیں۔ اخبار نے لکھا تھا کہ ایسا کسی مراٹھی اخبار میں چھپا ہے۔ اس کے بعد مراٹھی اخبار میں چھپا تھا کہ کسی اردو اخبار میں ہندوؤں کے دیوتاؤں کو برابھلا کہا گیا ہے۔

یہ دونوں گمنام سے، بہت کم تعداد میں چھپنے والے اخبار تھے، جنھوں نے دونوں فرقوں کے دلآزار کلمات کی خبریں چھپنے کی خبر شائع کی۔ اصل چھپے ہوئے مواد کو کسی نے دیکھا بھی نہ تھا۔

گن پتی تہوار سے کچھ دن پہلے، اسی باعث، ہندوؤں (مراٹھوں) اور مسلمانوں میں کشیدگی پھیل گئی تھی۔

تہوار کے موقع پر بھیونڈی میں ہندو مراٹھوں نے گن پتی جلوس کا راستا طے کیا۔ انھوں نے جلوس مسلم علاقوں کے بیچوں بیچ سے نکالنے کی ٹھانی۔ دوسرے دن کی تیاری میں انھوں نے راستے پر بھگوا جھنڈے لگانے شروع کر دیے۔ مسلم علاقوں میں، اُن کی آن میں یہ جھنڈے اکھاڑ پھینکے گئے۔ ان کی جگہ، جانے کہاں سے نکل کر، سبز جھنڈے لہرانے لگے۔ اس سرپھٹول میں دو تین مراٹھا ہندو لڑکے مارے گئے۔ یا زخمی ہو گئے۔

شوسینا کی تنظیم کے باعث مراٹھا نوجوان اتنے منظم ہو چکے تھے کہ دوسرے دن انھوں نے ایک ہولناک انتقام لیا۔

مہاراشٹر کے قصباتی علاقے کپڑے کی چھوٹی صنعتوں کے لیے مشہور ہیں۔ روزگار کی تلاش میں پورے ہندوستان سے کھنچ کھنچ کر بےروزگاروں کی ٹولیاں بمبئی اور اس کے آس پاس چھوٹے بڑے شہروں میں آتی ہیں، اور انجان سرزمین پر، کسی اپنے سے -- اپنی بولی بولنے والے یا اپنے ہم مذہب سے -- دو وقت کی روٹی کی خاطر جُڑ جاتی ہیں۔ یوپی، سی پی اور بہار سے

لاکھوں مسلمان بھی یہاں آ بسے ہیں۔ زیادہ تر کپڑے کے کارخانوں میں چھوٹا موٹا کام کرتے ہیں۔

وہ شاید ایک مسلمان چھوٹے موٹے سرمایہ دار کے کپڑے کے کارخانے کے مزدور تھے جنھیں خود پر حملے کا خطرہ تھا جو اس دن صبح ہی سے وہ مضافات میں اس کی کوٹھی کے پاس، اس کے ہی کھیت میں جا چھپے تھے۔

صبح دس بجتے بجتے، ان سے تعداد میں چوگنا بلوائیوں کا ہجوم، مسلمان کارخانےدار کی کوٹھی کے گرد جمع ہو گیا۔ کارخانےدار کی کوٹھی خالی تھی۔ اپنے خاندان کے ساتھ وہ روپوش ہو چکا تھا۔

مشتعل ہجوم نے دور دور نظر دوڑائی۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ دور دور تک کھیت کی ہریالی تھی۔

تب انھوں نے کھیتوں کو آگ لگا دی۔ لپٹوں سے تپے مسلمان مزدور بوکھلا کر باہر بھاگے۔ بلوائیوں نے کھیت سے نکلنے والوں کو گھیر کر، ان پر چاقوؤں اور چھریوں سے حملہ کر دیا۔ زخمی، تڑپتے ہوئے شکاروں کو انھوں نے واپس آگ میں جھونک دیا۔ شاید ان میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نہ نکل پایا تھا۔

ooo

" پہاڑی ولا میں سہما ہوا ایک مسلمان کنبہ...

چیکو، ککلی، بڑکی، ما اور با۔ بڑکی کی خوش طبعی رفوچکر ہو چکی تھی۔ اس کے چاند سے چہرے پر فکر کے بادل چھا گئے تھے۔ اچانک فسادات نے اس پر رمیش کے ہندو ہونے کا مطلب فاش کر دیا تھا۔ اس نے ما کے جلدی میں کہے ہوئے جملوں "پاکستان میں، پاکستان میں -- وہیں ہو گا تمہارا سیاہ" پر پہلی بار سنجیدگی سے غور کیا تھا۔ ہندو مسلمانوں کی لڑائی اس کے نزدیک اس کی اپنی زندگی کے بےفکر، ندی کے پانی کی طرح کلکلاتے بہاؤ میں ایک احمقانہ رکاوٹ تھی۔ "پاکستان میں لڑکے ہیں؟" اس نے سوچا تھا۔ "بےشمار!" ما نے اسے تسلّی دی تھی، "ایک سے ایک ہینڈسم!" ہمیشہ کی طرح ما کی تسلّیوں کو بڑکی نے شدید شک و شبے کی نظر سے دیکھا تھا۔ مگر اس پر یقین کرنے کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہ پا کر، خود کو یقین کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ وہ کتابیں کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ "چلو اس بار ما کو پاس ہو کر دکھا دو،" اس نے بےپروائی سے فیصلہ کیا تھا۔

ککلی کو کچھ مبہم سا اندازہ تھا۔ لڑائی ہو رہی ہے! کس کی، کس سے؟ وہ یہ سب نہیں سمجھ سکتی تھی۔ مگر وہ ما کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے سوٹ کیس میں رکھنے کے لیے کپڑے تہہ کرنے لگی ککلی۔

چیکو لڑھک اور رینگ کر احاطے میں جانا چاہتا تھا۔ یہ روزمرّہ کی معمولی سی بات! لیکن

آج با اور ما اسے اپنی انکھوں سے ایک پل کے لیے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ ان کی جان گلے میں اٹک گئی تھی۔ چیکو کو گھسیٹ کر انھوں نے اندر کر لیا۔ وہ سب ایک کمرے میں اکٹھے ہوے تھے، ایک دوسرے کی نظروں کے سامنے۔ ما کا ہاتھ بٹانے کے لیے، چھوٹی سی ککلی چیکو سے کھیلنے لگی۔ بدلی ہوئی صورت حال نے ما کے ذہن سے بیتی رات کے نقوش پل بھر میں مٹا دیے تھے۔ با آشا کے پاس گیا یا نہیں -- آج کے دن گزری رات کے واقعات کی کوئی اہمیت نہیں بن رہی تھی، اور کسی حیرت ناک شگاف کے ذریعے، جو دور رونما ہونے والے واقعات نے وقت کے تسلسل میں ڈال دیا تھا، کل کی رات کا آج کے دن سے کوئی رشتہ بھی نہیں بن رہا تھا۔ آشا ان کے لیے ناشتہ لائی۔ ہمیشہ کی طرح پُرسکون۔ اس کے لبوں پر اسی طرح ایک روشن مُسکان کی پرچھائیں تھی۔ ما مر کر دوبارہ زندہ ہونے پر بھی اس سدا شانت چہرے کو نہیں پڑھ سکتی تھی۔ اس نے با پر نظر ڈالی۔ اترے ہوے چہرے سے، انگلیاں چٹخاتا با۔ شاید وہ کوئی محیّرالعقول کارنامے انجام نہیں دے پایا تھا۔ شاید کسی بھی دو اجنبیوں میں پہلی بار ہونے والے جسمانی ملاپ کی طرح وہ ایک گھبرایا ہوا منھ رہا ہو۔ یا شاید ایسا نہ ہوا ہو۔ شاید با اپنی آتما خواب گاہ کی کھونٹی سے لٹکی چھوڑ گیا ہو۔ صرف بدن رہا ہو با! اس نے آکاش تک اڑان بھری ہو۔ اس کے بدن نے۔ گودُھولی کو چُھو آیا ہو با کا بدن آشا کے سنگ۔ گودھولی -- کہکشاں۔ ویدوں کی پرانی تشریحوں میں یہ گایوں کے گلّوں کی گزرگاہ تھی۔ نقرئی گھنٹیاں ٹنٹناتی، اپنے دودھ بھرے تھنوں سے آدمی کے منھ میں جاں‌بخش امرت ٹپکاتی، جو کسی ستاروں کے جنگل کی اور گئی تھیں۔ بعد کے تشریح کرنے والوں نے رگ وید میں گودھولی کا کچھ اور مطلب بتانے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا کہ دراصل یہ الجھاوا ایک لفظ کا غلط مطلب سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ "گو" دراصل روشنی کو کہتے ہیں۔ گودُھولی سے مراد یقیناً روشنی کا راستا ہے، نہ کہ گایوں کا راستا۔ بعد کے آنے والے، زیادہ خیال پرست مفسّرین کو شرمندگی ہوئی ہو گی کہ رگ وید کی حسین پرارتھنائیں کسی جانور کے لیے کی گئی ہوں۔ مگر دھرتی پر بستے، منّی اور پانی اور پیڑوں اور جانوروں سے بندھے کروڑوں ہندوؤں تک ان کی تفسیریں پہنچی بھی نہیں تھیں۔ اور انھوں نے آکاش پر اس روشن خم دار لکیر کو گایوں کا راستا ہی سمجھا تھا۔

با بمبئی میں طاہر بھائی کے گھر فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ طاہر بھائی گھر پر نہیں تھے۔ با نے طیّب بھائی کا نمبر ملایا۔ اتفاق سے طیّب بھائی مل گئے۔ وہ ابھی باہر نکلنے والے تھے۔

"ہم لوگ تو یہاں پھنس گئے ہیں۔ بمبئی آ جائیں؟"

"آ جائیے۔" طیّب بھائی کی دکھی، گجراتی آواز، میلوں سے اڑتی آئی۔ "یا... جہاں ہیں وہیں نکلنے کی کوشش کیجیے۔ فسادات تو بر جگ ہو رہے ہیں۔ بمبئی میں تو نام پوچھ پوچھ کر چاقو گھونپے جا رہے ہیں۔"

نام پوچھ پوچھ کر؟ ما نے حیرت سے سوچا تھا۔ شکلوں سے نہیں پہچانے جا سکتے ہندو

مسلمان! اسے ایک اڑا مٹا خیال آیا تھا کہ کراچی میں، پٹھان مہاجر فسادات میں، دونوں قومیتوں کو، یا تہذیبی اکائیوں کو، یا جو کچھ بھی وہ تھیں انھیں پہچاننا بالکل آسان تھا۔ اسے یاد آیا تھا کہ پچھلے مہینے، یوپی کے قصباتی فسادات میں، پاجامے اتار کر بلوائی ہندو مسلمان کی پہچان کرتے تھے۔ اس نے ککلی اور بڑکی کو ہدایت کی، "بمبئی پہنچنے پر کسی کو نام نہ بتانا۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں طیّب بھائی؟"

"بھیونڈی۔ فسادات کے متاثرین کی مدد کرنے۔"

با اور ما سُن ہو گئے۔ انھوں نے ایک دوسرے کا منھ دیکھا۔ انھیں یاد آیا کہ وہ کون ہیں۔ فسادات کی ناگہانی نے انھیں بالکل بھلا دیا تھا کہ عزم اور ہمت اور استقلال وغیرہ کوئی چیز ہوتے ہیں۔ جیسے بندھے ہوئے اسباب سے کھکھوڑ کر انھوں نے یہ سب ڈھونڈنے کی، سینے سے لگا لینے کی کوشش کی۔

رات پڑے... سبز جگنوؤں کے جھنڈ آکاش سے اترے تھے۔ اس جھلملاتی، حسین، تابناک دیوالی میں، جامنوں کے پتّوں کی پراسرار سرسراہٹ تلے، وہ اپنے ٹرانزسٹر ریڈیو پر بڑھتے ہوئے فسادات کی خبریں سنتے رہے تھے۔

اگر کسی تال کنارے
آسمان اور زمین کی گہرائیوں میں
تم کسی کو پکارو
اور تمھیں کوئی آواز سنائی دے
تو سمجھ لینا
یہ کسی دوسرے انسان ہی کی آواز ہو گی

ما نے نہ جانے کہاں پڑھی ہوئی سطروں کو یاد کیا۔ خوف اور ایک ناقابلِ وضاحت غم نے اس کا کلیجا مسوس دیا۔ اس نے بڑکی پر نظر ڈالی جسے وہ رات پڑے گھر سے نہیں نکلنے دیتی تھی، جس کے کنوارپن پر سانپ کی طرح پھن کاڑھے بیٹھی تھی -- جیسے اس کی اپنی ماں بیٹھی تھی، اور اس سے پہلے اس کی ماں -- اور اس وقت وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اگر... اگر خدا نہ کرے کچھ ہو جاتا ہے تو... تو بس، اس کا مطلب کچھ بھی نہیں۔ یہ سب تو... یہ سب امن کے زمانے کی باتیں ہیں۔

تو سمجھ لینا -- یہ کسی انسان کی آواز ہے۔

کیسا انسان ونسان؟ یہ ہندو مسلم فسادات تھے۔ اس میں انسان نہیں تھے، ہندو تھے اور مسلمان تھے۔ انسان کی انسانیت کو پکارنے کی کوشش بےسود تھی۔

ما نے انسانیت کو نہیں پکارا تھا۔ چشم زدن میں، اپنے خیال پرست ذہن میں کسی جھپاکے سے سما جانے والی حیران کن سوجھ بوجھ نے اسے آدمی کے حماقت خیز خواب کو جگانے، کوئی ڈور اٹکا کر اس سے لٹک جانے، اور اپنا کنبہ پار لے جانے پر اکسایا تھا۔ جوئے کی ایک اندھی بازی کی طرح اس نے سواجی ٹیکسی والے سے کہا تھا:

"بمبئی لے چلو گے ہمیں؟ ہم ایک فلم ایکٹر کے گھر جائیں گے۔"

سواجی ٹیکسی والا، جو وہیں ترائی میں گھومتا پھرتا تھا، اور اس سے پہلے کبھی ماتھے پر سیندور مَلے نہ گھوما تھا، جس نے یہ سیندور شاید فسادات کے اعزاز میں لگایا تھا، اور جو یوں بھی، فسادات کے جوش میں اینڈتا ہوا ٹیکسی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، فلم ایکٹر کا نام سن کر موم ہو گیا تھا۔ ایک جھلملاتا خواب اس کی آنکھوں میں سما گیا تھا۔

"بائی، میرے کو ملائے گی؟" اس نے ہنس کر کہا تھا۔

"ہاں... فلم ایکٹر بنو گے تم؟"

سواجی ٹیکسی والا ہنسنے لگا۔ اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھول دیا -- اس مسلمان خاندان کو بحفاظت بمبئی تک لے جانے کے لیے، جسے وہ قتل کرتا یا نہ کرتا (کیونکہ اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں تھے)، کم از کم، دو چار لوگوں کے ساتھ مل کر، انتشار کے اس لمحے میں، لوٹ تو ضرور سکتا تھا۔ لیکن فسادات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ فلم والوں سے ملنے کا موقع بار بار کہاں آتا ہے! اس کی سیاہ آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ وہ زیرلب ایک مراٹھا گیت گنگنانے لگا تھا۔

طیّب بھائی نے تو انہیں ٹکے رہنے کو کہا تھا۔ سفر کرنا خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ پھر ما اور با کے پیر کیوں‌کر اکھڑ گئے؟ کیقباد اپنی ولا میں قتل کر دیا گیا تھا۔ کیقباد؟ وہ کیسے؟ وہ تو مسلمان تک نہیں تھا! اور یہ ہندو مسلم فساد تھے۔

"دھوکے میں بائی!" سواجی ٹنکی والے نے بتایا تھا۔

"دھوکے میں؟" ما کا منہ حیرت سے پھٹا رہ گیا تھا۔ "کیقباد کا نام ہندوؤں جیسا نہیں تھا۔ اس لیے کیا؟ دھوکے میں مارا گیا!"

"ہاں۔ نیچے سے کوئی آیا تھا۔ ادھر کا نہیں تھا بائی۔"

دوسری صبح کیقباد کو اس کے بستر میں خون میں نہایا، اکڑا پڑا دیکھ کر، بات پھیل گئی تھی۔ اس کے بعد کیقباد کی ولا مقامی لوگوں نے ہی لوٹی تھی۔

اب ما اور با کے لیے وہاں ایک لمحہ ٹھہرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ جب ایک واردات ہو گئی تھی تو اب بات ختم ہونے والی نہیں، پھیلنے والی تھی۔ پولیس کا دھیان ترائی کے قصبوں میں لگا تھا۔ پولیس تو پہاڑی پر موجود ہی نہیں تھی۔ نابود ہو چکی تھی پہاڑی سے۔ سو جب موت کا خطرہ ہر طرف ہو، تو جان بچانے کی ایک کوشش کیوں نہ کر لی جائے۔

سب سے آخر میں ولا چھوڑنے والی ما تھی۔ آشا کا ہاتھ تھام کر، ہینڈبیگ سے سو پچاس روپے نکال کر، اس کے ہاتھ میں تھما کر، وہ نیچے جانا چاہ رہی تھی۔ سہ پہر ہونے کو تھی۔ تب

تک کچھ اور خبریں پہنچ رہی تھیں۔ کاشٹے کا لنگوٹ کسے ایک قلی عورت ابھی ابھی آشا کے پاس سے گئی تھی۔ گود میں بچّہ سنبھالے وہ تھوڑی دیر خاموشی سے باتیں کرتی رہی تھیں۔

"کیا کہتی تھی؟" ما نے گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ کسی انجانی بولی میں سوگوشیوں نے اس کے بدترین خوف جگا دیے تھے۔اس کا دل دیوانہ وار دھڑک رہا تھا۔ ذہن میں بار بار یہ خیال آتا: یہ ٹیکسی ڈرائیور... ہمیں کہاں لے جائے گا؟

"کیقباد کو..." آشا نے آہستہ سے کہا، "سرلا کے باپ نے مار ڈالا ہے .. اس کی رکھیل تھی نا، اس کے باپ نے۔ ورلی رات کو پہاڑ پر چڑھا۔ ادھر اُدھر چاقو گھونپے جا رہے تھے۔ بس یہی موقع دیکھا۔"

اس انکشاف کو اپنے خوف زدہ دماغ میں سمونے کی کوشش کرتی ما ٹیکسی میں بیٹھی تھی۔ وہ کیقباد کے قتل میں دھوکے کے عنصر کا صحیح مقام متعین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کس نے کس کو دھوکا دیا؟ دھوکا تو تھا، شاید دوہرا دھوکا۔ کیقباد مسلمان ہونے کے دھوکے میں نہیں مارا گیا۔ ورلی نے لوگوں کو دھوکا دیا کہ یہ ہندومسلم فساد ہے۔

پھر اس کے ذہن سے الجھاؤ کی پھانس نکل گئی۔ اس نے دل ہی دل میں اپنی ساری قوّت گاڑی کے چلنے میں لگا دی۔

ٹیکسی کا دروازہ بھڑاک سے بند کر کے، مشین کو ایک بھاری غرّاہٹ کے ساتھ چلا کر، مراٹھی میں کوئی نعرہ مار کر، پہاڑی ڈرائیور نے گاڑی کو پوری، اندھادھند رفتار سے دوڑا دیا تھا۔

مضبوطی سے بچّوں کو تھامے بیٹھی تھی ما۔ فرّاٹے سے آیتیں پڑھتی ہوئی۔ جیسے ذہن کا کوئی بند توڑ کر اس پر آیتوں کی بارش ہو رہی تھی۔ کیا اسے واقعی اتنی آیتیں یاد تھیں؟ اتنی زیادہ... شاید ہی کوئی آیت دوہرائی ہو۔ زندگی بھر مطلب کے خبط میں گرفتار رہنے کی وجہ سے اسے ان سب آیتوں کے معنی معلوم تھے۔ لیکن اس وقت وہ معنی سے ماورا تھی۔ بلکہ معنی اس کی یکسوئی میں رکاوٹ تھے۔ وہ نہیں جاننا چاہتی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے؛ کہ خدا ربّ العالمین ہے، کہ اس نے جمے خون کے لوتھڑے سے انسان کو پیدا کیا، کہ انسان خدا کا راز ہے اور خدا انسان کا راز ہے...

سواجی ٹیکسی والا فلم ایکٹروں کی حسین، چمکاتی دنیا کے خواب میں مسحور ہو گیا تھا۔ اس کا سراپا ہی جیسے بدل گیا تھا۔ چمکیلے خواب کی سرایت سے اس کا چہرہ جگمگا گیا تھا۔ آنکھوں میں کہیں دور کا منظر اتر آیا تھا۔ ٹیکسی اسٹارٹ کرنے سے پہلے وہ "میں ابھی آتا ہوں" کہہ کر وہیں ایک جھاڑی کے پیچھے پیشاب کرنے گیا تھا۔ تب ذرا فاصلے سے ما نے اسے دیکھا تھا۔ بھورے آسمان تلے، جنگلی جھاڑی کے پاس رفع حاجت کرتا ہوا آدمی، جس کے گویا عین سر پر ایک خواب کسی بڑی سی طلائی، چمکاتی بھنبھیری کی طرح گونجار کر رہا تھا اور منڈلا رہا تھا۔

ٹیکسی اس کے کتے کو گود میں بھرے، پہاڑی ڈھلانوں سے چکراتی ہوئی، اندھادھند نیچے اتر رہی تھی۔

ما نے سرخ پہاڑ پر نظر ڈالی، جس کی پُرشکوہ دراڑوں میں اسے تال نظر آیا۔ اسے سرلا کا چہرہ یاد آیا۔ اور پھر اسے یاد آیا، وٹھو کربٹ! وٹھو کربٹ کی سنائی ہوئی، گھنٹوں پر محیط داستان۔ اس کا کانکھتا، کانپتا لہجہ۔۔۔

"ورلیوں نے کھاتےدار کو جنگل میں گھیر لیا تھا۔ نئیں نئیں! مارا پیٹا نہیں تھا۔ بس کپڑے اتارے۔ لنگوٹی پہنائی۔ ایک گٹھا لکڑی اس کے سر پر رکھّی۔ اور بولے: اُدھر جاؤ۔ اب اِدھر آؤ۔ اب اُدھر جاؤ۔ ہا ہا ہا!" وہ ہنسا تھا۔ یاد سے اس کی بجھتی آنکھیں اور بھی دھندلا گئی تھیں۔ "اور بولے: ہل میں جوتیں تیرے کو؟ کھاتے دار رو رہا تھا۔ کانپ رہا تھا۔ گوداوری مائی ایک دم ناراج ہوئی سن کر۔۔۔ گوداوری مائی ناراج ہوئی۔ ایسا کرنے کا نئیں! بولی۔ پن بائی، وہ تھوڑا ہنسی بھی تھی۔

"ورلی اکٹھا ہوا نا بائی، تو کھاتےدار سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔ لوٹ کر آیا معاملت دار کے ساتھ۔ پن ہم سب کو تو مالوم تھا۔ ایسا ہی ہونا ہے۔ ورلی ایک کے پیچھے ایک گیا۔ ہزاروں ورلی۔۔۔"

"ہزاروں؟" ما نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا تھا۔

"ہاں ہاں، ہزاروں۔ ایک دم لیف رائٹ لیف رائٹ۔ سینا کے جیسے۔ اور گوداوری مائی نے ایک دم بولا: ڈرنا نہیں۔ ہٹنا نہیں۔ ایکدم سیدھی بات۔ ڈھائی روپیا اور تین روپیا مجُوری، اور گھاس کی کٹائی ساڑھےچار روپیا۔ اکھیر کو مانا۔ پن پہلے کہاں! کتنے سو کو تو جیل میں ڈالا تھا۔ کتنے سو کو۔۔۔"

گوداوری مائی!

گوداوری مائی کوئی دیوی نہیں تھی۔ وٹھو کربٹ کی داستانیں، اس کے کہن سال، شکست و ریخت کے شکار دماغ کی بنائی انمل بےجوڑ تصویریں نہیں تھیں۔

گوداوری مائی -- گوداوری پارولیکر، دراصل گوداوری گوکھلے -- انڈین کمیونسٹ پارٹی کی ایک کارکن تھی، جیسا کہ اس پہاڑی سے اتر کر، بمبئی میں، سنچری بازار کے پاس پارٹی آفس کے رکارڈوں میں آپ کو پتا چل سکتا ہے۔ ۱۹۴۵ سے ۱۹۴۷ تک کے دوران، دو برسوں میں، اس کے کام نے زمین داروں کی مار کھاتے، بیگار بھرتے، ان کے اور پولیس کے ہاتھوں آئےدن قتل ہوتے آدی واسی ورلی کسانوں کو ایک حیرت انگیز تحریک کی صورت میں منظّم کر دیا تھا۔

پارٹی آفس ریکارڈ۔ گوداوری گوکھلے کی تحریر۔

"یہ نومبر ۱۹۶۲ کی بات ہے، جب مَیں اور دوسرے ساتھی جیل میں تھے، کہ مجھے کچھ یادداشتیں لکھنے کا خیال آیا۔ ۱۹۶۵ میں، جب ہمیں یارےوادا سنٹرل جیل بھیجا گیا، میں نے کچھ لکھنا شروع کیا ۔۔۔ لوگ سوچیں گے، میں آدی واسیوں میں کیوں گئی تھی۔ دراصل جب

۱۹۴۲ میں ہمیں جیل سے رہائی ملی تھی۔ تب میں نے اور کامریڈ شام راؤ نے مہاراشٹر کے کسانوں میں کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر جب ۱۹۴۵ اور ۱۹۴۶ میں ہمیں دوبارہ جیل بھیجا گیا، تھانے ڈسٹرکٹ سے علاقہ بدر کرنے کے بعد۔۔۔"

آنسوؤں کی ایک موٹی چادر نے ما کی آنکھوں میں یہ تحریر دھندلا دی تھی۔ مسلسل قید و بند کی، علاقہ بدری کی، ورلی کسانوں کے جھونپڑوں میں راتیں گزارنے کی، گھنے جنگلوں کو پیدل پار کرنے کی، پہاڑیوں پر، کھلے آسمان تلے راتیں بتانے کی، عدالتوں میں گھسیٹے لیے جانے کی ایک ششدر کرنے والی، دل چیر دینے والی داستان۔

۱۹۴۵ سے ۱۹۴۷ تک۔

گوداوری مائی! ما آنسوؤں کے بیچ ہنسی۔ جسے چائے کی عادت تھی۔ جو جھونپڑیوں میں پورے دو سال رہی۔ اسے کھلے جنگل جانے کی عادت نہیں پڑ سکی۔ اسے باتھ روم کی تکلیف ہوتی تھی۔

"مگر جیت ورلیوں کی ہوئی۔" آگے لکھا تھا۔ "گھاس کا گٹھا آخرکار، ساڑھے چار روپے میں ہی لیا جانے لگا۔"

پارٹی آفس کے دھول بھرے ریکارڈ میں ہمیشہ کے لیے حنوط شدہ اور مدفون یہ ایک کہانی تھی۔ ایک بھولی بسری داستان جو اب کسی کو بھی یاد نہیں۔ واقعات کے اس گٹھے ہوئے باقتے میں، جسے کوئی جلاہا اپنے کرگھے پر ان گنت سوت کے دھاگوں سے لگاتار بُنے جا رہا ہے، یہ صرف ایک ڈور تھی، جس کا پتا بھی نہیں چل سکتا۔ جو ان گنت رنگوں میں مل کر ہمیشہ کے لیے گم ہو چکی ہے۔ گوداوری کی یاد البتہ، اس نسل کے بڈھوں کے دلوں میں تھی۔

اس تحریک کو یاد رکھنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ کیوں‌کہ یہ ایک کامیاب تحریک تھی۔ یہ اپنا چھوٹا سا مقصد پورا کر کے ختم ہوئی۔ جیسا کہ گوداوری پارولیکر نے لکھا، گھاس کا گٹھا بہرحال ساڑھےچار روپے میں خریدا جانے لگا تھا۔ چند ہی برسوں میں مہنگائی نے بڑھ کر ساڑھےچار روپے کو ایک فحش مذاق بنا دیا تھا۔ پر اس کا گوداوری کے جیون سے، اس کی کل نقدحیات سے تعلق نہیں تھا جو اس مراٹھن نے دن اور رات کے چھن چھناتے سکّوں کی طرح ورلیوں پر نچھاور کر دی تھی اور جدید ادب کے تمام ثقہ اصولوں کو سرِمو خاطر میں نہ لا کر، ایک لرزہ خیز، بامقصد زندگی گزاری تھی۔ وہ شاید اب زندہ نہ ہو، اور اس کی شب و روز کی محنت کسی خرچ کی ہوئی کائناتی توانائی کے انبار میں کہیں خلا میں چکراتی ہو؛ کیوں‌کہ فرائے سے آپتیں پڑھتی ہوئی ما کو، بمبئی پہنچ کر، ایک بوڑھے فلم ایکٹر سے ایک مکالمہ سن کر بھونچکا ہو جانا تھا کہ "کرم کبھی ناش نہیں ہوتا۔"

000

محفوظ مقام پر پہنچ کر، جب ان کی جان میں جان آئی تو غصّے سے ما اور با کا خون

کھَولنا شروع ہوا۔ اس قدر اَتیاچار؟ گھور ناانصافی! فوراً ایک بیان تیار کر کے وہ اپنے دوستوں اور جان پہچان والوں سے دستخط کرانے کی مہم میں جُٹ گئے۔ (انھیں یہی کام آتا تھا!)

"ہم اس خوں‌ریزی کی مذمّت کرتے ہیں!" بیان کا لب لباب یہ تھا۔

دستخط کرانے کے لیے، با اسے فلم اسٹوڈیو لے گیا۔ آرٹ فلموں کا ایک سندھی ہدایت کار اس کا دوست تھا۔

وہ ایک دانشور تھا۔ ایک پُرکشش دانشورانہ داڑھی کا مالک، تقریباً ادھیڑ سندھی، جو ابھی تک جوان ہی نظر آتا تھا۔ وہ با سے پہلے مل چکا تھا۔ با کے دیہاتی پن پر رشک کر چکا تھا۔ وہ اپنی سرزمین سے اکھڑا ہوا تھا۔ سندھی ہونے کا احساس اس کے لئے تقریباً ایک پوشیدہ احساس جرم تھا۔ وہ کامیاب تھا اور ہندوستان کی دانش ور دنیا اسے پُوج رہی تھی۔ لیکن وہ اس احساس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا تھا کہ وہ بمبئی میں، پورے ہندوستان میں، ایک "غیر" ہے۔ وہ حسین سے حسین اور بامعنی فلمیں بناتا تھا۔ آدی واسیوں کا استحصال اس کا موضوع تھا۔ لیکن کہاں تھے وہ لوگ جو اس کے اپنے ہوں؟ سب جانتے تھے کہ وہ سندھی ہے۔ با کا دیہاتی پن دیکھ کر وہ اس کے ساتھ کھل گیا تھا۔ اکیلے کسی کونے میں با کو گلے لگا کر رویا تھا۔

"بھوں بھوں... میں سندھی ہوں۔"

با نے اس کو تسلّی دی، سمجھایا۔

"وہاں تو سب مسلمان ہیں۔"

لیکن آرٹ فلموں کا ہدایت کار کون سا اعتقاد کرنے والا ہندو تھا! وہ تو ناستک تھا۔ لادین، دہریہ۔ ہندو ہونا اس کی شخصیت کی صرف ایک منفی، چوٹ کھائے والی جہت تھی، جس کے باعث اس کے خاندان کو اپنی جنم بھومی خواہ مخواہ چھوڑنی پڑی تھی۔ کیا فرق پڑتا اگر وہ سندھ میں ہوتا؟ ان لوگوں میں جن کی بولی، ریت رواج، موسیقی، سب کچھ اس کی اپنی انتڑیوں سے نکلتے ہوتے؟

"فرق پڑتا!" با نے اسے سمجھایا تھا۔ "بہت اچھا ہوا تم وہاں سے چلے آئے۔ اگر وہاں ہوتے تو کبھی آرٹ مووی نہ بنا پاتے۔ فلمیں وغیرہ تو وہاں تقریباً ختم ہی ہو گئی ہیں۔"

"وہ کیوں؟" اس نے غور کرنا چاہا۔

با کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس وجہ سے فلمیں اس کے وطن سے تقریباً ختم ہی ہو گئیں۔

"اگر میں ہوتا... تب دیکھتے!" سندھی ہدایت کار نے جوش میں آ کر کہا۔

با ہنسنے لگا۔ "کیا دیکھتے؟ کچھ بھی نہ ہوتا۔ بھئی وہاں مارشل لا لگا رہتا ہے زیادہ تر۔ اور پھر... تم ہندو ہو یار!"

آرٹ مووی کا ہدایت کار جی مسوستا رہ گیا۔ اس کی زندگی کا المیہ اس کی ذات سے پرے، کہیں اور تھا۔ اور وہ یہ کہ ایک صوبے کی اکثریت مسلمان تھی جس کی وجہ سے وہ

غیرطبقاتی خوں‌ریزی نہیں چاہتا تھا۔ اس کا دل نرم تھا۔ ان کے چہروں پر گمبھیر دکھ اتر آیا۔ مگر وہ خاموش تھے۔ کمرے میں ہر شخص خاموش تھا۔

"آخر اس وقت..." ما نے کہا۔ "کوئی بھی ہندو سچ کیوں نہیں بول رہا ہے؟"

جیسے بجلی کا کرنٹ چھو جائے، وہ سب اس طرح چونکے۔ وہ ہکا بکا رہ گئے۔ برسوں سے کسی نے ان کے منھ پر "ہندو" کا لفظ اس طرح دے نہیں مارا تھا۔ جن حلقوں میں وہ اٹھتے بیٹھتے تھے، وہاں خیالوں کی، نظریات کی باتیں ہوتی تھیں۔ کوئی کسی کے مذہب کا ذکر اس طرح نہیں کرتا تھا۔ ما کے ہاتھ سے بیان کا کاغذ لے کر انھوں نے فوراً دستخط کر دیے۔

"ویسے..." ہدایت کار بے گہری کڑواہٹ اور دبائے ہوئے غصّے سے کہا، "ہم سب ہندو جاتی میں اتفاق سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ تو شاید آپ جانتی ہوں۔ یہ ایک پیدائش کا حادثہ ہے۔"

"بس تو پیدائش، جو ہمارے بس میں نہیں، ہم پر کچھ ذمےداریاں ڈالتی ہے۔ اور انھیں جوں توں نبھانا ہی پڑے گا۔" ما بڑبڑائی۔ یہ اسے کون سی نئی بات بتا رہے ہیں؟ لیکن اس کا کیا علاج کہ ازروئےاتفاق یہ ہندو ہیں اور اس کاغذ کو انھی کے دستخطوں کی ضرورت تھی۔

ما کے ذہن میں اس وقت نہیں تھا۔ مگر بعد میں اسے خیال آیا: یہ تو کوئی گیتا کی سطریں تھیں۔ "بس تو اے ارجن! یہ یدّھ تو تجھے کرنا ہی ہے۔ تو چاہے یا نہ چاہے، اس کے لیے ذمےدار ہو یا نہ ہو۔ مگر جو فرض حالات نے تجھ پر ڈالا ہے اسے پورا کرنا ہی تیرا دھرم ہے۔" بےخیالی میں فلم والوں کو گیتا کا اُپدیش دے کر مسلمٹی رفوچکر ہوئی۔

السٹریٹڈ ویکلی نے سیاہ سرورق چھاپا اور اس پر سرخ حرفوں میں لکھا: شرم!

ہندوستانی لیکھکوں، فنکاروں، دانشوروں نے اس خوں‌ریزی کی مذمت کی تھی۔ ہندوستان کے اخبارات اس بہیمیت کی مذمت سے بھرے پڑے تھے۔ مگر وہ زیادہ تر انگریزی اخبار تھے۔ مسلمان انگریزی اخبار زیادہ تر نہیں پڑھتے تھے۔ شاید پڑھ سکتے بھی نہیں تھے۔ قیاس یہی ہے کہ پڑھے لکھے، روشن خیال ہندو طبقے میں اپنے لیے بےساختہ اٹھنے والی ہمدردی کی لہر سے مسلمان بےخبر ہی رہے ہوں گے۔

رات کو با اور ما نے شامل جی کے گھر جانے کی ٹھانی۔ طیّب بھائی نے بمبئی میں انھیں کسی دوسرے ہم فرقہ کے خالی فلیٹ میں جوہو کے پاس ٹھہرا دیا تھا۔ شامل ہندوستانی فلموں کے ایک کیریکٹر ایکٹر تھے، لیکن وہ برسوں سے کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بھی تھے۔ تقسیم سے پہلے وہ لمبے عرصے کراچی میں رہے تھے۔

بڑکی اور ککلی اپنے کمرے میں کھٹرپٹر کر رہی تھیں۔ کل ہم باہر نکلیں گے، دونوں بچیاں پروگرام بنا رہی تھیں۔ ما نے کمرے میں جھانکا۔ ایک منٹ کے لیے وہ دونوں کی ہیئت کذائی دیکھتی رہی۔ بڑکی نے الٹی سیدھی اس کی ساڑھی لپیٹ لی تھی۔ ایک دوپٹّے سے ککلی کو لہنگا

پاکستان میں شامل ہو گیا تھا، اور اسے اپنے کنبے سمیت ہندوستان آنا پڑا۔ اور نہ جانے کتنی نسلوں تک ایک کبھی تذکرہ نہ کی جانے والی، مگر پتھر کی طرح سخت بےوطنی کو اپنے پیٹ میں جھیلنا پڑا۔ اور اس سلسلے میں کوئی کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ ڈیموگرافی نے آرٹ فلموں کے سندھی ہدایت کار اور بےشمار سندھی ہندو شاعروں، کہانی کاروں اور دانش وروں کے ساتھ ہاتھ کر دیا تھا، جو اپنا تہذیبی وجود بچانے، یا جس بھی پردیش میں رہ پڑے ہوں ان میں مل جانے کی دو متضاد خواہشوں کی چکّی کے پاٹوں کے بیچ پسے جا رہے تھے۔

سندھی ہدایت کار مارکسی تھا۔ آدی واسیوں کی زندگی پر فلمیں بناتا تھا۔ لیکن عورتوں کے لیے اس کے خیالات اپنی ہی طرح کے تھے۔ اس کی تمام فلموں میں عورتیں کسی نہ کسی چیز کا استعارہ ہوتی تھیں۔ زیادہ تر مردوں کی غیرت کا استعارہ، جسے پامال کر کے بالائی طبقہ محنت کشوں پر ستم ڈھاتا تھا۔ یا پھر، اگر وہ کافی پُرگوشت ہوں، تو چمکتے کاسٹیوم پہنا کر وہ دنیاوی حرص و ہوس کا استعارہ بن سکتی تھیں۔ کچھ بھی ہو، وہ چپڑ چپڑ تقریریں نہیں جھاڑتی تھیں۔

ڈائریکٹر نے ما کے بارے میں سنا تھا کہ وہ انٹلکچوئل ٹائپ کی ہے۔ وہ تلخ ہنسی ہنسا تھا۔ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اس طرح کی عورتیں، دراصل، کسی جنسی کج روی کے رجحان کو دبا کر، اس کے نعم البدل کے طور پر انٹلکچوئل بن گئی ہیں۔

اس وقت وہ ایڈیٹنگ روم میں، ایک کامنی سی حسین معاون کے ساتھ اپنی نئی فلم کے رَش پرنٹ دیکھ رہا تھا۔

ما پر اس نے ناقدانہ نگاہ ڈالی۔ اس کے تصوّر کو دھچکا لگا۔ ما ذرا بھی گلیمرس نہ تھی۔ بےڈھنگے کپڑوں میں، اجاڑ صورت لیے ایک عورت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ جب دستخط کرنے کے لیے ما نے کاغذ اس کے سامنے بڑھائے تو اس نے ایک نظر ڈالی۔ پھر کہا:

"اور مسلمانوں نے جھگڑا کیوں کیا؟ اڑتیس برس بعد پہلی بار بچارے مراٹھوں نے گن پتی کا جلوس نکالنا چاہا تھا۔"

آرٹ فلموں کا ہدایت کار نکسل وادیوں کا ہمدرد تھا۔ اس کا دل ان کی تشدّد کی حکمت عملی کا ساتھ دیتا تھا۔ شوسینا میں بھی غریب مراٹھے شامل تھے۔ وہ ان کے تشدد کے بارے میں کیا محسوس کرتا تھا؟ یہ وہ صاف صاف نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ تو صاف صاف یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے بہتر چوٹ کھایا ہوا، اپنی جنم بھومی سے بلاقصور مار بھگایا ہوا جی خونی انقلاب کی آرزو کرتا ہے یا صرف تشدّد کے لیے تڑپتا ہے۔

"شاید مسلمانوں نے غلطی کی،" ما نے دانت بھینچ کر کہا، "لیکن کسی بھی غلطی کی سزا، پیٹھ میں چُھرا گھونپ کر آگ میں جھونکنا نہیں ہوتی۔ یا ہوتی ہے؟ کیا یہ ایک اقلیت کے ساتھ بدترین ظلم نہیں ہوا؟"

ہدایت کار اور اس کی کامنی سی معاون متاثر ہو گئے۔ ہدایت کار شعوری طور پر

سا پہنا دیا تھا۔ دونوں کے ماتھے پر چوڑی چوڑی بندیاں لگی ہوئی تھیں۔ بڑکی اپنے خیال میں بندو ہونے کا بہروپ بھر رہی تھی اور حسب معمول خوشی سے بےقابو ہوئی جا رہی تھی۔

"تمہارا نام سیتا اور میرا نام گیتا۔ کوئی پوچھے تو یہی بتانا -- سمجھیں؟"

"اچھا!" ککلی نے خوشی سے سر ہلایا۔ اس کے کان چھدے ہوے نہیں تھے۔ بڑکی نے اپنے لمبے بُندے اس کے بالوں میں پن سے لگا دیے تھے۔ ککلی انہیں جُھلانے کے لیے سر ہلا ہلا کر ہاں اور نا کہہ رہی تھی۔

ما منہ پر ہاتھ کر ہنسنے لگی۔

"ایسے ہوتے ہیں بندو؟" ما نے ہونٹ کاٹ کر پوچھا۔

بڑکی اور ککلی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بڑکی نے اپنا اور ککلی کا دل بھر کر حلیہ پیٹا تھا۔ کاجل کی لکیریں پھیر پھیر کر بھنویں کانوں تک کھینچ دی تھیں۔ ہونٹوں پر لال سرخ لپ اسٹک لگا کر انہیں چوڑا بنا دیا تھا۔

کھی کھی کر کے بڑکی ہنسی۔

"نہیں تو۔ مکر ما! ہم تو بن رہے ہیں نا -- جھوٹ موٹ۔"

ما کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس کے دل میں ایک زہریلی آرزو دعا کی طرح لہرائی، مار دے کوئی بلوائی مجھے خدا کرے--- راستے بھر وہ ڈر سے کانپتی رہی تھی بلوائی کے چھرے کے خوف سے۔ راستے میں انہوں نے جلے ہوے مکان دیکھے تھے۔ راستے کے کنارے منہ کے بل الٹی پڑی ہوئی ایک لاش دیکھی تھی۔ اور پھر جیسے ان پر ترس کھا کر سورج ڈوب گیا تھا۔ ہر چیز پر اندھیرا چھا گیا تھا۔ ان منظروں کو اندھیرے نے چھپا دیا تھا۔ سواجی ٹیکسی والا ابتدائی گیت گنگنا کر رفتہ رفتہ خاموش اور مغموم ہو گیا تھا۔

با نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے کھنچے ہوے لہجے میں ہوں ہاں میں جواب دیا۔ وہ کچھ خوفزدہ بھی ہو گیا تھا۔ اس چھوٹی سی کھٹارا گاڑی میں ما اور اس کا کنبہ ہی تو ایک ہندو کے ساتھ نہیں بیٹھا تھا؛ وہ خود بھی تو مسلمانوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ بمبئی کا رہنے والا بھی نہیں تھا۔ مسافروں کو ان کے بتائے ہوے پتے پر پہنچاتے ہوے، راستے میں کسی مسلمان علاقے سے گزرنے کے خیال نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ پھر بھی وہ ٹیکسی ڈرائیوروں کے مخصوص لاابالی پن اور بےفکری کے سے انداز میں پوری رفتار سے گاڑی چلائے جا رہا تھا۔ صرف شامل جی سے ملتے ہوے، ان سے ہاتھ ملاتے ہوے، وہ جیسے دوبارہ زندہ ہوا تھا، پھر سے پہلے جیسا بنا تھا۔ ایسا نہیں جیسا وہ بلوے والے دن تھا؛ فسادوں سے محفوظ فاصلے پر، فسادوں کی خبریں سن کر بےاسباب انکڑائی لیتا اور اینڈتا ہوا۔ وہ ایسا ہو گیا تھا، جیسا وہ بلووں سے پہلے تھا۔ احاطے کی روشنی میں ما کو اس کی پرانی، شناسا ہنسی چمکتی ہوئی نظر آئی تھی، جب پہاڑی اسٹیشن پر وہ سواریاں بھرنے کے لیے جھٹ پٹ آوازیں لگاتا تھا۔

ما اور با صرف اس سے اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے، رات پڑے شامل جی کے گھر چلے آئے تھے۔ سواجی ٹیکسی والے کو شامل جی سے ملا کر وہ طیب بھائی کے بتائے ہوے پتے پر پہنچے تھے۔ پھر خوف نے اپنا پراسرار وقت پورا کر کے، تھکا مار کے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اچانک -- اب

ذرا بھی خوف نہ تھا۔ ما کے دل میں اب ایک حقارت بھری بےفکری سما گئی تھی۔ لگتا تھا جیسے اس میں اچانک کوئی آسمانی طاقت بھر گئی ہو۔ اس وقت وہ اپنی اصلی طاقت سے کہیں بڑھ کر کچھ کرنے کی کوشش کر سکتی تھی۔ اور شاید گردن تڑوا بیٹھتی، کیوں‌کہ یہ ایک وہم تھا۔

با اور ما کو شامل جی نے گلے سے لگایا۔

بوڑھے سینے کی گرمی اور شفقت محسوس کر کے ما تھرتھرا گئی۔ اس کی آسمانی طاقت غائب ہو گئی۔ اس نے مشکل سے آنسو ضبط کیے۔

"دیکھیے--- یہ کیا ہو رہا ہے؟" ما نے شامل جی کے جھریوں بھرے ہاتھ تھام کر کہا۔ پھر وہ غرائی۔ "اور آپ لوگ--- آپ لوگ کچھ بھی نہیں کرتے؟"

بوڑھے شامل جی نے حیرت بھری مسکراہٹ سے منہ پھاڑ دیا۔

"تو کیا کریں ہم؟ ارے بھئی ہم کیا کریں؟"

ان کی آواز میں بڑھاپے کی ہلکی سی لرزش تھی۔ فلموں میں کتنی نہلی لگتی تھی، ما نے حیرت بھری مسکراہٹ سے سوچا۔ مگر یہ تو اصلی شامل تھے۔ اصلی شامل جی! بالکل ویسے جیسے فلموں میں نظر آتے ہیں۔ شامل جی کو اداکاری کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پھر اسے فسادات یاد آئے۔ اس کا دل پھر غم اور غصے سے تڑپا۔

"اب یہاں نام پوچھ پوچھ کر چُھرے گھونپے جا رہے ہیں۔"

"تو؟ تم سمجھتی ہو مجھے کوئی چُھرا نہیں گھونپ سکتا؟ مجھے تو مسلمان بھی مار سکتے ہیں اور ہندو بھی۔ فرقہ پرست لوگ سیکولر آدمی کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں۔"

ما یہ بات جانتی تھی۔ مگر اس کے سینے میں دل کسی پتھر کھائے پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔

"دیکھو---" شامل جی نے کہا۔ "اب ہمارا راج تو ہے نہیں۔ ہمارا راج ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔ جہاں کمیونسٹ حکومتیں ہیں وہاں کبھی سنا بلوہ فساد ہوتا؟ کیرالا ہے، بنگال ہے، وہاں کبھی سنا؟"

ما ڈبڈبائی آنکھوں سے شامل جی کا منہ تکتی رہی۔ یہ سچ تھا۔ نہ مغربی بنگال اور نہ کیرالا میں۔ ہندو مسلم فساد نہیں ہوتا تھا وہاں۔

شامل جی نے اسے اپنے بڈھے سینے سے بھینچ لیا۔ "جب انقلاب آ جائے گا نا--- تب نہیں ہو گا ایسا۔ مجھے پورا یقین ہے۔"

جب انقلاب آ جائے گا!

ما جھٹکے سے شامل جی سے علیحدہ ہو گئی۔

"مگر انقلاب نہیں آ رہا ہے شامل جی!" اس نے بےبس غصے سے کہا۔ اچانک وہ شامل جی

پر اس طرح برسنے پر جان سے شرمندہ ہوئی۔ لیکن وہ دہاڑیں مار مار کر رونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کسی منشی کی طرح کہا "اور میرا خیال ہے کہ..."

"کیا؟"

"کہ بنگال اور کیرالا میں بھی..." اتنا کہہ کر بات اس کے ذہن میں پھر الجھ گئی۔

"یہ تو سچ ہے" ما نے مانا، "کہ بنگال اور کیرالا میں فساد نہیں ہوتے۔ کمیونسٹ حکومتیں اس میں حصے دار نہیں ہوتیں۔ لیکن... یہ اتفاق ہے۔"

"اتفاق؟"

"نہیں... کمیونسٹوں کا فساد نہ کروانا اتفاق نہیں۔ لیکن اتفاق یہ ہے کہ بنگال اور کیرالا میں کمیونسٹ حکومتیں ہیں۔ میرا مطلب ہے، اصل میں تو یہ شمالی ہندوستان کے غلبے کے خلاف... ایک قوم پرست تحریک ہے بنگال میں اور کیرالا میں۔ یوپی کی لیڈرشپ کے پیچھے نہیں چلنا چاہتے یہ لوگ..." اس نے پریشانی میں وہ بات کہہ ہی ڈالی جو نہ جانے کب سے اس کے دل میں اٹکی تھی، جسے وہ کھل کر خود بھی تسلیم نہ کرتی تھی۔

"نہیں! نہیں نہیں!" شامل جی نے نفی میں انگلی ہلائی، "کیرالا میں تعلیم بہت زیادہ ہے۔"

"تعلیم؟" ما چلائی۔ "تعلیم سے فرقہ پرستی کہاں جاتی ہے؟ آپ نے فرقہ پرست موضوعات پر ڈاکٹریٹ کی تھیسس نہیں دیکھیں؟"

اسے [illegible] پرستی کی چھپی ایک کتاب کا خیال آیا "اکبر کے دور میں ہندوؤں کی اصلی بدحالی" جسے [illegible] ڈاکٹریٹ کے لیے لکھی گئی تھی۔

"بات یہ [illegible] اور خود کو کہتے سنا، جیسے یہ اس کی جانی پہچانی آواز نہیں تھی، "کہ [illegible] نہیں جاتی ہے۔"

اس وقت [illegible] سوتی بہت کر روتا تھا۔ ابھی بات سن کر اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے دنیا [illegible] کے سر پر گر رہی ہے۔

"بات یہ ہے کہ... یہ بات نظریاتی نہیں ہے، شامل جی!" ما نے آنسو پی کر کہا۔ "یہ تو انبوہ کی بڑی قدیم، ادنیٰ جبلتیں ہیں۔ گروہ بنانے کی، گلے سے جڑے رہنے کی، جو نظریاتی روپ دھارن کر لیتی ہیں۔"

"کیا؟ تم طبقاتی اتحاد کو کچھ سمجھتی ہی نہیں ہو؟"

"طبقاتی... ہاں،" ما نے کہا، "مگر نظریاتی... نہیں۔"

"بات یہ ہے کہ..." ما نے سوچ سوچ کر بات منہ سے نکالی۔ "لمبے دورانیے میں جو آپ دیکھو تو... شیعہ مزدور شیعہ سرمایہ دار کے خلاف... دوسرے مزدوروں کے ساتھ اتحاد کر لیں۔ یعنی اگر کہیں۔ فرض کیجیے شیعہ سنی بھی دو فرقے رہتے ہوں تو۔ پر ایک لمبے دورانیے میں... سنی مزدور بھی اگر شامل ہو جائیں... تو پھر وہ دونوں دیر تک ساتھ جائیں گے نہیں۔"

"ٹھیک ہے! ٹھیک ہے!" شامل جی نے رسان سے کہا، "وہ تو سب جانتے ہیں۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ مذہب افیون ہے معاشرے کے لیے..."

"اس کا تعلق مذہب سے کہاں ہے، شامل جی!" ما بے ساختہ چلائی۔

کس چیز سے تعلق تھا اس کا؟ یہ بات خود اس کے ذہن میں صاف نہیں تھی۔ دماغ کے کسی اندھیرے گوشے سے۔ جیسے خون اور حرام مغز کے ذرّوں سے کھینچ کھینچ کر، نکال کر، اس نے کہنا چاہا: "نامنطق سے۔ اس چیز سے جو سمجھ کے الٹ ہے۔ جو انتڑیوں میں ہے۔ خون میں، گوشت میں۔ جو بڑھتا ہے۔ پھلتاپھولتا ہے۔ جو مرتا ہے۔۔ مرنے سے ڈرتا ہے۔ جو اندھا ہے۔ اندھا اور گونگا بہرا۔۔۔ مذہب تو سمجھ ہے۔ مذہب سے آدمی کا رشتہ ہے کتنا؟ شاید ایک فی صد بھی نہیں؛ جس نے آدمی کی کھال بھی نہیں کھرچی۔ اسلام نے نادر شاہ کو مجبور نہ کیا کہ دلّی میں کھوپڑیوں کے مینار نہ چنے۔ اور بدھ مت نے جاپانیوں کو نہ سکھایا کہ سونے کی انگوٹھی کے لیے جنگی قیدیوں کی انگلیاں نہ کاٹ لیں۔ اور عیسائیت نے امریکنوں کو منی لائی میں نہ روکا کہ بڈھی ویت نامی عورتوں کو اپنا ننگ چوسنے پر مجبور نہ کریں جب کہ وہ درختوں سے بندھے دشمنوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوں۔۔۔ مذہب ہو۔۔ یا نظریہ۔۔ سو تو سمجھ ہے شامل جی۔ شاید روح ہوتی ہو گی۔۔۔"

مبہوت سے کھڑے شامل جی اس کی بات سن رہے تھے۔ پھر وہ ایک لمبی، تھرتھراتی سانس لے کر بیٹھ گئے۔

"تم اتنی باتیں کرتی ہو۔۔۔" انھوں نے کہا۔ "آدمی ہندو ہے، مگر بنگالی بھی تو ہے۔ وہ مسلمان ہے، مگر تمل بھی تو ہے۔ ملاح نہ ہے، مگر وہ بھی تو ہے۔ لیکن ابھی۔۔۔ فی الحال، پہاڑ میں جاتے کئی ہزاروں سال پرانے جھگڑوں میں پڑ کر۔ ایک بات ہو سکتی ہوتی ہے تمھارے دماغ سے۔ یہی آدمی آدمی ہے، مگر سرمایہ دار بھی تو ہے۔ ہوتی ہے ایک جنم طبقاتی کردار بھی۔ کون کراتا ہے یہی یہ فسادہ؟ جانتی ہو؟ یہ پراپرٹی ڈویلپرز۔۔۔ کنسٹرکشن کمپنیوں والے۔ جانتی ہو کیوں؟ یہ جھونپڑپٹیاں جو بس ناڑ نہیں جانی کرانے کے لیے۔ ان پر کئی منزلہ عمارتیں بنانے کے لیے۔ غریب مزدوروں کو پیسے دے دلا کر، تھرا پلا کر، لڑواتے ہیں خون خراب۔ سرکاری افسروں کو، سیاسی لیڈروں کو، سب کو پیسہ کھلاتے ہیں۔ اور سب کھاتے ہیں پیسہ۔۔۔" پھر وہ تھم کر بولے:

"اس سے پہلے بھی ہوتے ہیں فساد۔ پہلے تاملوں سے ہوتے۔ وہ بھی مزدور سارے۔۔ بےچارے غریب۔۔ آ گئے یہاں۔ یہی رورکر جو ملتے ہیں۔ اس نے آ گئے۔ مال گودی ہے یہاں۔ بڑا پورٹ ہے۔ جہاں پورٹ ہو گا، لوگ آ جائیں گے ادھر ادھر سے۔ کلکتے میں دیکھو، کہاں کہاں سے آ جاتے ہیں لوگ۔ پھر گھر بھی واپس جاتے ہیں رات کو۔ دن میں کلکتے کی آبادی دگنی ہوجاتی ہے۔"

ما نے تاملوں کے فسادات کا سوچنے کی کوشش کی۔۔۔ بس ایک بار ہوئے تھے۔۔ اس کے دماغ میں آیا۔۔ اور ہندو مسلم دنگے، ہر روز، ہر مہینے!

"یہاں پراپرٹی ڈویلپرز۔۔۔ اور دوسری جگہ کوئی اور وجہ ہو جاتی ہے۔ کہیں کی حکومت گرانی ہو تو ہندو مسلم فساد کرا دیتے ہیں۔ کہیں کانگریس کی مخالفت پیدا کرنی ہو، یا کہیں حمایت پیدا کرنی ہو، تب ہندو مسلم فساد کرا دیتے ہیں۔ کسی کو مندر کے نام پر پیسے اکھٹے کرنے ہوں، تب ہندو مسلم۔۔۔ بلی کے بکرے ہیں مسلمان؟"

شامل جی کا منھ اتر گیا۔ ہوش سنبھال کر کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ ان کے

اپنے دل میں مذہبی نفرت نہ تھی۔ وہ مذہبی لڑائیوں کو سمجھنے سے قاصر تھے کیا؟ کیا انہیں پتا نہیں چلتا کہ... کہ کیسا لگتا ہے؟ ما نے عاجز آ کر سوچا۔ پھر اسے یاد آیا۔ پتا کیسے نہیں لگتا ہو گا! شامل جی خود سینتالیس کے فسادات میں کراچی سے آئے تھے۔ اسے خیال آیا کہ مسلمانوں نے بھی بہت کچھ کیا۔ اسے خیال آیا کہ کافی عرصے تک، مشرقی پاکستان میں، بنگالی مسلمانوں نے ہندو مسلم فسادات جاری رکھے۔ بنگالی ہندوؤں کو مار بھگانے، ان کی جائیدادوں پر قبضہ کر لینے کے لیے... اس کے اپنے والے حصے میں۔ مغربی پاکستان میں نہیں ہوتے ہندو مسلم فساد۔ لیکن وہاں اب ہندو ہیں ہی کتنے؟ دیکھنے کو بھی نہیں ملتے۔ سندھ میں ہیں تھوڑے بہت، پڑے ہوئے کہیں کونے کھدرے میں۔ اور یہاں... یہاں ہیں مسلمان... کروڑوں ہیں۔ دور دور تک پھیلے ہوئے، عجب طرح سے۔ گاؤں گاؤں، کوئی چھوٹے سے چھوٹا گاؤں مشکل سے ہو گا جہاں دو چار گھر نہ ہوں مسلمانوں کے۔

کتنے ہیں مسلمان یہاں؟ وہ سوچ رہی تھی۔ بارہ کروڑ۔ کوئی کہتا ہے پندرہ کروڑ۔ پھر بھی کم ہیں، اس کے دل میں خیال آیا۔ اسے گوبنکر کی بات یاد آئی۔ یہ آدی واسی۔ آدی واسی بھی ہندو ہی بنیں گے؟ آبر از وینر ار کی سند ہر؟ کوئی ہندو مراٹھا بن جائے گا۔ کوئی ہندو تامل بن جائے گا۔ اس کا دل ڈوب گیا۔ اور بڑھ جائیں گے ہندو! اس کا بس چلتا تو کسی جادو سے ایک ایک مسلمان کے ہزار ہزار بچے پیدا کر کے، آناً فاناً مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے برابر کر دیتی... پھر دیکھتے، کیسے کرتے ہیں یہ خوں ریزی!

"کیا سوچ رہی ہو؟" شامل جی نے پیار سے پوچھا۔ ما نے بےبسی سے ان کا منھ تکا۔ اسے بڑا عجیب سا لگا۔ شرم کے مارے وہ شامل جی کو بتا نہیں سکتی تھی کہ وہ اصل میں کیا سوچ رہی تھی۔ آخر کیوں؟ دل کی کون سی تہہ اس کے خیالوں کو گھٹیا سمجھ رہی تھی؟ اس نے کوشش سے جھجک مٹا کر، بےخوفی سے، بوڑھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

"سوچ رہی تھی کہ مسلمان کتنے کروڑ ہیں یہاں... برابر برابر ہوتے ہندو مسلمان تو اچھا رہتا۔"

"کیوں؟" شامل ہنسے۔ "تب خوب فساد ہوتے؟ برابر برابر کا؟"

ما گھبرائی ہوئی پھیکی ہنسی ہنس دی۔ "نہیں۔ تب شاید نہ ہوتے فسادات۔"

شامل جی اداسی سے ہنسنے لگے۔

"یہ گنتی مت کرو۔" انھوں نے کہا۔ "گنتی سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیا ہوتا ہے گنتی سے؟ جو تم سمجھ رہی ہو اس کا الٹ۔ دیکھو..." بوڑھے شامل جی نے اسے دھیان دلایا۔ "جہاں مسلمان کم ہیں، بالکل کم، وہاں نہیں ہوتے فساد۔ تامل ناڈ میں نہیں۔ کرناٹک میں نہیں۔ جہاں زیادہ ہیں، برابر تک پہنچ رہے ہیں، وہاں بڑی زور سے ہوتے ہیں۔ ہے نا؟"

شامل جی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ما گڑبڑا گئی۔ اسے اپنا بچکانہ حساب کتاب بےسود لگا۔ پھر وہ بڑبڑائی:

"کچھ بھی ہو شامل جی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت اچھی نہیں ہے۔ شدید عدم تحفظ کا عالم ہے۔"

"تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ چیزوں کو معروضی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کرو۔ تم تو بالکل ہلی ہوئی ہو جڑ بنیاد سے اس وقت!" شامل جی نے کچھ تاسف سے کہا۔

ما سچ مچ ہل گئی تھی۔ انسان ہی تو تھی وہ۔ کوئی فرشتہ تو نہیں تھی۔ آخر اس نے نگاہیں اٹھا کر کہا:

"معروضی کیا مطلب؟ مسلمان مارے جاتے ہیں۔ قتل ہونے والوں سے آپ توقع کرتے ہیں کہ سمجھ داری سے صورت حال پر غور فرمائیں گے! قتل ہونے والا سمجھ داری سے نہیں سوچ سکتا۔"

"ہاں!" شامل ہنسے۔ "قتل کرنے والا بھی سمجھ داری سے نہیں سوچ سکتا..." لیکن شامل جی سنجیدہ ہو گئے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات ان کے لیے بھی کوئی ہنسی مذاق کی بات نہ تھی۔ وہ ایک نظریاتی آدمی تھے۔ پرانے کمیونسٹ۔ ساری فلمی مصروفیات کے باوجود پابندی سے پارٹی میٹنگ میں شامل ہوتے تھے۔ وہ ایک سنجیدہ انسان تھے۔ پُرخلوص اور گرم جوش۔ ما کی سراسر غیرکمیونسٹ باتوں نے انھیں اندر سے جھنجھوڑ سا دیا تھا۔

شامل جی کمرے میں ٹہلنے لگے۔

"یہ... مسلمان... یہ مسلمان..." شامل جی نے ٹہلتے ٹہلتے کہا۔ شامل جی کہاں کے رہنے والے تھے؟ کسی عجیب و غریب اتفاق سے وہ صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے۔ ان کی آنکھیں ہلکی بھوری تھیں۔ ان کے باپ دادا فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ شین قاف درست ہونے کی وجہ سے انھیں ہندوستانی فلموں میں مسلمان کا رول دیا جاتا تھا۔ جیسا کہ اکثر فلموں میں ٹوکن کے طور پر ایک نیک مسلمان بوڑھے کا کردار دکھایا جاتا ہے۔

"کیا کریں مسلمان؟" ما بڑبڑائی۔

"پڑھیں... لکھیں،" وہ ٹہلتے ٹہلتے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔ پھر انھیں کچھ خیال آیا۔

"انگریزی پڑھیں، انگریزی۔ چھوڑیں یہ مدرسے ودرسے کا کلچر۔ اردو مدرسہ، ہُنھ!" انھوں نے منھ پچکایا۔ "آگ لگائیں اسے۔ بس انگریزی پڑھیں۔ کمپیوٹر!" شامل جی کو سُوجھا۔ "کمپیوٹر سیکھیں۔ میں تو کہتا ہوں..." انھوں نے اپنی ہلکی سی لرزش زدہ آواز میں کہا، "ہندوستان میں جتنے کھاتے پیتے مسلمان ہیں .. جگہ جگہ، قصبے قصبے، شہر شہر .. مسلم انگلش اسکول بنائیں۔ بس لگا دیں اس کام میں اپنے آپ کو۔ یہی حل ہے اس مسئلے کا۔"

بنا کسی وضاحت کے شامل جی اپنی بات کہے چلے جا رہے تھے۔ آخر اس سے فائدہ کیا ہو گا؟ کیا فسادات رک جائیں گے؟ ما کو انگریزی پڑھنے کا اور کمپیوٹر سیکھنے کا اس مسئلے سے کوئی تعلق نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور نہ شامل جی کوئی تعلق بنا پا رہے تھے۔ آخر کیوں پڑھیں انگریزی؟ اس کے بدلے... اس کے بدلے ہتھیار کیوں نہ جمع کریں؟

مگر شامل جی ایک لمبی تقریر میں مصروف تھے۔ وہ چھت کی طرف انگلی اٹھا کر تقریباً چھت سے لگے پنکھے سے مخاطب تھے۔ آخر ما سے نہ رہا گیا۔ اس نے شامل جی کا بازو ہلا کر کہا: "لیکن کیا اس سے فسادات رک جائیں گے؟"

شامل جی اچانک رک گئے۔ شاید انھوں نے اپنی بےربط تقریر پر خود غور کیا۔ بات تو

فسادات کی بو رہی تھی۔

"فسادات... تو نہیں رکیں گے۔" شامل جی نے کاغذ کی طرح کوری آواز میں کہا، "لیکن..."

"لیکن کیا؟" ما نے بےتابی سے پوچھا۔

"لیکن..." شامل جی نے نہ جانے کس یقین سے کہا۔ "ہندوستان میں مسلمانوں کو آج... ایک نئے سرسید کی ضرورت ہے۔"

ما کا منھ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "سرسید کی؟" اس نے نہایت حیرت زدہ ہو کر یاد کیا کہ واقعی سرسید... سرسید نے کہا تھا کہ انگریزی پڑھو... انگریزی... انگریزی تعلیم... یہ بات کبھی اسکول میں پڑھی تھی اور اب کب کی بھول چکی تھی۔

"مگر اُس وقت تو... اُس وقت تو انگریز تھے یہاں شامل جی۔ اب تو شاید... ہندی پڑھنی چاہیے۔" ما نے بلا سوچے سمجھے کہا۔

"ارے نہیں" شامل جی جھنجھلائے۔ "جھوٹ بول رہے ہیں سب کم بخت۔ یہ خود کوئی ہندی وندی نہیں پڑھ رہے۔ انگریزی پڑھ رہے ہیں سب۔ اور کمپیوٹر سیکھ رہے ہیں۔" پھر انھوں نے سکون سے کہا۔ "تب پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پچاس ساٹھ برس میں... رُل کھُل کر... ٹھیک ہو جائے گا۔"

ما کے ذہن میں کئی خیال اکٹھے آ رہے تھے۔ سرسید کے خیال نے اس کی منجمد یادداشت کو چونکا دیا تھا۔ اور دوسرا خیال اسے یہ آ رہا تھا... جس نے اسے تھوڑا سا محظوظ اور کافی حیران کیا تھا... کہ شامل جی بالکل مسلمان لگ رہے تھے۔ فلموں میں مسلمانوں کا کردار ادا کرتے کرتے بالکل مسلمان ہو گئے کیا؟

اور تیسرا خیال... چونکنے والا۔ آنکھوں میں پانی لے آنے والا خیال۔ تو شامل جی جانتے ہیں، خوب جانتے ہیں۔ کہ انقلاب وغیرہ نہیں آئے گا۔ یوں ہی، اپنےآپ کو تسلی دیتے ہیں۔ دھوکا دیتے ہیں اپنےآپ کو... اور طبقے نہ ہوتے... طبقے بھی نہیں جانتے ہیں کیا؟ کیوں اپنے فرقے کی اصلاح کرنے کے پیچھے لگے رہتے ہیں؟ جانتے ہیں کہ رہے گا تو یہی فرق۔ اس کی اصلاح ضروری ہے۔ انقلاب... انقلاب شاید نہیں آئے گا!

"اور دوسری بات یہ..." شامل جی ٹھہرے ٹھہرے تھم کر بلند آواز سے کہہ رہے تھے، "کہ کرم کبھی ناش نہیں ہوتا۔" شامل جی کے اندر شاید اس گھڑی، جب وہ محتاط نہ تھے، ان کی نانی اور پرنانی اور دادی اور پردادی نے مل کر کہا تھا۔

ما بھونچکی رہ گئی۔

پھر دل کے کسی پاتال سے جھمک اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

"ہندوستان شامل جی" اس نے دل نے سوچا۔ اور ایک انجانی تعظیم سے خم ہو گیا۔

"رواداری سے کام لینا چاہیے۔ یہ سب... رواداری..." دھیرے دھیرے شامل جی کچھ کچھ کہتے جا رہے تھے۔ جیسے اپنےآپ سے۔

ما نے سوچتے ہوئے کہا، "اب تو یہ سا تصور بھی نکلا ہے کہ کھچڑی کی دیگ..."

"کھچڑی؟"

ما شرمندہ ہو گئی۔ پھر اس نے کچھ ہنس کر کہا؛ "میں... ایک اخبار میں مضمون تھا کہ ہم شاید کھچڑی کی دیگ نہیں ہیں..."

"پھر کیا ہیں ہم؟"

"سلاد کا پیالا ہیں۔" ما ہنسی۔ "یعنی سب کے ذائقے الگ الگ۔"

شامل جی کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ دیر تک ہنستے رہے شامل جی۔ ان کے گلے میں پھندا لگ گیا۔ انھوں نے ایک گلاس پانی پیا اور کہا؛

"الّو کے پٹھے ہیں ہم اصل میں تو..." پھر انھوں نے کہا؛ "کھچڑی کی دیگ میں اوندھایا سلاد کا پیالا۔ جو کسی سے نہ اگلا جائے نہ نکلا جائے۔"

ما خاموش ہو گئی۔ اسے پھر سرسید کا خیال آ رہا تھا۔ گھنی سفید داڑھی... اسکول کی کتابوں کے صفحوں سے نکل کر گویا تصویر اس کی آنکھوں میں سما رہی تھی۔ اور یادیں... جھولی پھیلا پھیلا کر چندہ مانگتے تھے۔ انگریزی تعلیم۔ انگریزی تعلیم۔ مسلمانو! انگریزی تعلیم حاصل کرو... تحریک کامیاب ہو گئی۔ مسلمانوں نے ... کچھ مسلمانوں نے ... پڑھا لکھا۔ اور پھر؟ ما کے دماغ میں ایک خیال چمکا۔ پھر انھوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا۔ پاکستان کا مطالبہ! ہندوستان کو تقسیم کرنے کا! ہندو اور مسلمانوں نے پڑھ لکھ کر، ایک دوسرے کی گلے میں بانہیں ڈال کر پیار کا گیت نہیں گایا۔ پڑھنے لکھنے کے بعد ایک دوسرے پر لعنتیں بھیجیں۔ بجّا دیا۔ بے لحاظ لعنت ٹھیک تھی! ما کے ذہن میں سندھی لعنت کا طریقہ گھوما۔ اور ایک دوسرے پر تھوک کے الگ ہو گئے۔

سب ہی لوگ دن رات، ہر گھڑی، کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے الگ ہونے کی فکر میں گرفتار۔ سندھی۔ بنگالی۔ اور انھیں بالکل اندازہ نہیں (ما دل میں قہ قہ کر کے ہنسی) کہ الگ ہو کر پھر وہ ایک دوسرے میں کتھم گتھا ہی رہ جاتے ہیں۔ جوں کے توں رہ جاتے ہیں حالات اس ہندوستان میں تو۔ کیونکہ یہ ایک جادو ہے (اس نے سوچا) جسے براجین کالوں میں باہمنوں نے بتوں میں مچھر مارتے ہوئے کھوجا۔

"چیزیں بدلتی ہیں۔" انھوں نے کہا ہو گا۔ اور پھر اکتا کر، جمائی لے کر اضافہ کیا ہو گا؛ "اور پھر جُوں کی تُوں بھی رہ جاتی ہیں۔"

کیوں بھئی؟

"کیونکہ... چیزیں اور کائنات کے مظاہر ہی تو بھگوان ہیں۔ اب بھگوان کے لیے تو کچھ بھی ناممکن نہیں۔ چاہے ایک سے دو ہو جائے۔ دو سے ہزار۔ اور پھر بھی ایک کا ایک ہی رہے۔"

ظاہر ہے۔ اس جواز کا رد تو ناممکن تھا۔

شامل جی اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔

"کھانا نہیں کھاؤ گی؟" انھوں نے کہا۔ "کہ اور کوئی بات رہ گئی ہے؟"

ما نے حیرت سے انھیں دیکھا۔

"اور کوئی عالمی مسئلہ جسے ہم حل کر سکتے ہوں اس سمے؟"

ما کھسیانی ہو گئی۔ بری طرح شرمندہ۔ اپنے مچھر سے بھی کم حیثیت، بھُنگے جیسا ہونے

کے انکشاف پر، اپنی بیہودہ بڑک بازیوں پر... شامل جی نے ان کے لیے کھانا بنوایا تھا اور وہ اسے کب سے ٹھنڈا کر رہی تھی۔ اس نے اپنے منہ پر آئے "کیا کچھ نہیں ہو سکتا؟" کے قابلِ رحم، لجلجے سوال کو دل میں واپس پھینک دیا۔

فسادات کی مُردہ رات ان کے اوپر سے گھسٹتی ہوئی گزر رہی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ کرتے رہیں گے۔

اس نے سوچا:

آدمی آدمی کو کب قتل کرتا ہے؟

غصّے میں؟ ہاں۔

لالچ میں؟ ہاں۔

خوف میں؟ ہاں۔

اور ویسے؟

اور ویسے... اس کی مرضی!

اور کب محبت کرتا ہے آدمی، آدمی سے؟

اس کے تھکے دماغ میں ایک رقص سا ہو رہا تھا۔ جیسے کسی پہاڑی پر الاؤ جلا کر ڈھیر سے آدی واسی اس کے گرد ناچ رہے ہوں۔ اور اوپر گھنگھور سیاہ گھٹاؤں میں بجلی چمک رہی ہو، بادل گرج رہے ہوں۔

اس سوال پر جیسے پہاڑوں میں زور سے دھماکا ہوا ہو۔ دور تک تالیاں سی بجتی ہوئیں۔

"آدمی، آدمی سے محبت نہیں کرتا!"

خدا نے سختی سے کہا ہو۔

غلط... ما نے سوچا۔ وہ اب کھانا کھانے جا رہی تھی، شامل جی کی بانہہ میں بانہہ ڈالے۔ وہ شامل جی سے محبت کر رہی تھی۔ اور درآں حالیکہ اس بات کا ٹھوس ثبوت، چھوا جانے والا، موجود نہ تھا، پرنتو یہ بات اس میز، اس کرسی، اس پلیٹ اور چاول دال جتنی حقیقی تھی۔

ما نے پلیٹ میں دال چاول ڈالے۔

اور آدمی میں سمجھ کب آتی ہے؟

کیا پیٹ میں روٹی پڑنے سے؟

ہاں۔ ایک طرح کی۔

کیا بھوکے رہنے سے؟

ہاں۔ ایک دوسری طرح کی۔

اور دونوں صورتوں میں...

ایک تیسری طرح کی سمجھ خبط ہو جاتی ہے۔

دیوتاؤں نے گرج چمک میں کوئی سریلا قہقہہ لگایا اور ناچتے رہے۔

"تم جیت نہیں سکتے،" انہوں نے کہا۔

"اور آدی واسی۔ یہ آدی واسی، جہاں تہاں بکھرے ہوے، ہندوستان میں، اناج بیتے، اور کاشت بھی کرتے، کسی نوبل سےوبج، کسی شاندار بَن دیوتا کا جیون نہیں بتاتے تھے،" کوسمبی نے کہا (اپنی کتاب میں): "ان کے قبیلوں کا سردار ہوتا تھا۔ پنچ ہوتے تھے۔ پر پنچ سرداروں کے خلاف مشکل ہی سے جاتے ہوں گے۔ یہ شاید اپنے دیوتاؤں پر انسانی قربانیاں بھی کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے سے جنگیں کرتے تھے۔

"یہ ایسا سانچا ہے منش کے جیون کا، کئی کالوں سے گزرتا ہوا، جس کی ایک پرت بالکل دوسری ہی پرت جیسی ہے۔

"اور ان کا کچھ بھی سانجھا نہیں تھا۔ سب کے دیوی دیوتا الگ۔ اور بولیاں---"

ہاں بولیاں؟

"وہ---" کتاب نے قہقہہ لگایا۔ "چودہ کوس پر سب کی الگ الگ بولیاں تھیں۔ اور ہیں۔" ما بھی خوب ہنسی۔

اتحّاد کی، ماشا اللہ سے، کسی قسم کی، کوئی گنجائش چھوڑی نہیں گئی--- یہاں، یعنی کہ اس برصغیر میں۔

کھانے کے بعد شامل جی نے انھیں خود کافی بنا کر پلائی۔ ان کی جھک سپید بالوں والی، دبلی پتلی، پٹھان پتنی اپنے کمرے میں جا کر سو گئی تھیں۔

"ہندوستان کی موجودہ، کثیرالتصادم صورت حال، اگر باریکی سے دیکھا جائے تو، قبل از تاریخ ہندوستان ہی کا ایک عکس ہے،" کتاب نے کہا، "دھرتی کے اس ٹکڑے پر جیون بتانے والے آدی واسیوں کی صورت حال کا۔"

"مارو سالوں کو!" ما نے جیسے کسی نشے میں کہا۔

"اب دو بجے کہاں جاؤ گے؟ یہیں سو جاؤ۔"

"نہیں، بچّے اکیلے ہیں شامل جی۔"

فسادات کی پُرخطر رات میں، شامل جی انھیں اپنی گاڑی میں خود ڈرائیو کر کے ان کے فلیٹ کی طرف لے چلے۔ ان کا ڈرائیور فسادوں سے گھرے کسی علاقے میں رہتا تھا۔ وہ چار دن سے نہیں آیا تھا۔

راستے میں شامل جی ان سے باتیں کرتے رہے۔ پیار بھری باتیں۔

"تم لوگ ضرور کامیاب ہو گے، کوئی کچھ بھی کہے۔"

(ہندوستان میں کچھ لوگ ان سے کہتے: جمہوریت؟ پاکستان میں؟ کسی دوسرے مسلم ملک میں بھی آئی ہے جمہوریت؟)

"وہ لوگ بہت عظیم ہیں،" شامل جی کہہ رہے تھے، "جب میں کراچی میں ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری کے مزدوروں میں کام کرتا تھا---"

(لوگ بتاتے، ہر پارٹی میٹنگ میں شامل جی اپنی بات اسی جملے سے شروع کرتے تھے۔ "جب میں ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری میں...")

"اور میں تو کہتا ہوں..." شامل جی نے کہا۔ "یہاں، ہندوستان میں، آئے یا نہ آئے... لیکن وہاں، پاکستان میں انقلاب ضرور آئے گا... وہ لوگ... دوسری طرح کے ہیں وہ لوگ... مجھے ان سے پوری امید ہے۔"

شامل جی نے اپنا بوڑھا، اشتیاق اور یقین اور امید کی پوپلی مسکراہٹ سے روشن، چہرہ پچھلی سیٹ میں بیٹھے اپنے مہمانوں کی طرف موڑ کر کہا۔

انہیں فلیٹ پر چھوڑ کر، اندھیرے میں وہ اکیلے ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل دیے۔

OOO

"تم نے کیوں اسے پتا دے دیا؟" ما نے تلملا کر کہا تھا۔ "نیچے فساد ہو رہے ہیں۔ یہ شیوسینا کا لڑکا..."

ما نے دھرمانند کو کیوں بمبئی کا پتا دے دیا تھا؟ ما کو خود ٹھیک سے معلوم نہ تھا۔ بس دے دیا تھا۔ شاید اس کی کئی وجوہات ہوں۔ ایک تو لڑکے کی بےخوفی پر، بازار میں، بغیر تعارف اس سے بھڑ جانے پر، ما کا دل اس لڑکے کی طرف کھنچ گیا تھا۔ اس کی بدحالی اور قومی جوش کے تضاد نے ما کا دل کاٹ سا دیا تھا۔ لیکن اس کی ایک اور بھی وجہ ہو سکتی تھی۔ خوف۔

ما خوف سے اپنے اندر سمٹ رہا تھا۔ وہ سوچتا، ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں۔ کسی ہندو سے بات کرنا اس وقت ٹھیک نہیں۔

ما خوف سے پھیل رہی تھی۔ کہا جا سکتا ہے وہ خوف سے لڑ رہی تھی۔ وہ سوچتی، ہندو مسلم فساد ہو رہے ہیں۔ اس وقت کسی ہندو سے فوراً بات کرنی چاہیے۔ اپنا آپ چھپا کر رکھنے سے اکیلا پن کانپ رہا ہے۔

لیکن دھرمانند نے تو سچ مچ اسے فون کیا۔ بمبئی کے ایک اخبار میں اس نے ان کے بارے میں ایک چھوٹی سی خبر پڑھ لی تھی۔ اس طرح وہ اس کی نظر میں معتبر بن گئے تھے۔ اب خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ اس نے ان کے فلیٹ پر آ گیا دھرمانند۔ دو تین دن فسادات کی لہر، عرب ساگر کے کنارے بسے اس مہانگر سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی تھی۔ بمبئی معمول پر آ گیا تھا۔ کوئی اپنا سر پیٹ پیٹ کر سوچ سکتا تھا، یا خدا! کیا یہی لوگ آپس میں لڑے تھے؟ اگر انہیں ایک دوسرے سے اتنی نفرت ہے تو اب کیوں نہیں لڑ رہے؟

شاید دوسرے راؤنڈ کی تیاری کر رہے ہوں!

لیکن یہ ایسی جھڑپیں نہ تھیں جن کی کسی آخری فیصلہ کن جنگ کے بارے میں سوچا جا سکتا۔

"میڈم... آپ تو یہاں کی ہیں بھی نہیں۔ میں آپ کو لے چلتا ہوں۔ اپنی چالی میں۔ دس از دی ریوولوشن۔"

دھرمانند جزوقتی طالب علم تھا۔ کسی شام کے کالج میں پڑھتا تھا۔ دن میں تو وہ ایک ریستوران میں اسسٹنٹ منیجر کا کام کرتا تھا۔ سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا، گھر کے دھلے، گھر میں استری کیے سفید پتلون قمیص میں۔ اس کے ماڈرن حلیے سے، جلدی میں ماتھے پر مَلا سیندور لگا نہیں کھاتا تھا۔

ما اور با اس کے ساتھ ایک "معائنہ مہم" پر نکلے۔ دھرمانند نے اپنے دل میں انہیں غیرملکی جان کر مقامی مسلمانوں سے الگ کر لیا تھا۔ غیرملکیوں کے لیے تو اس کے دل میں بےحد جوش و خروش تھا۔ جیسا کہ اس پورے برصغیر میں ہوتا ہے۔

اس کی چالی دادر کے پاس تھی۔ جہاں وہ ٹاٹا کی صاف ستھری بس میں پہنچے۔

دھرمانند کی چالی، بمبئی کی مخصوص، کھولیوں پر مشتمل، پرپیچ رابداری تھی۔ دن کے دس بجے کھولیوں پر صرف عورتیں تھیں۔ کوئی بچہ، پنگوڑے میں جھولتا ہوا، اپنی کھولی میں رویا۔

"یہ باتھ روم ہے۔ یہ ڈسٹ بن۔ ہم نے رکھوایا ہے۔"

دھرمانند انہیں خوشی سے دکھا رہا تھا۔ "اور یہ کپڑے دھونے کی جگہ..."

"یہ سب تو... بہت اچھا کام ہے!" ما کا دل ان کے لیے پگھل گیا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ فاصلے اور لاعلمی میں ہر چیز کیسی بدل آتی ہے!

"کیا بمبئی میں ایسی بہت سی چالیاں ہیں؟" با نے پوچھا۔

"بمبئی نہیں۔ موم بائی!" لڑکے نے سختی سے کہا۔

ما اور با حیران ہو گئے۔

"موم بائی۔ موم بائی... یہی اصلی نام ہے۔" لڑکے نے انہیں سمجھایا۔ "دس از مراٹھالینڈ۔ دس از مراٹھا نیم۔"

ما اور با نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کی سمجھ میں خاک نہ آ رہا تھا۔ بمبئی ان کے ذہنوں میں، موم بائی نہیں ہو سکتی تھی۔ بمبئی تو... بمبئی تھی!

ایک دھچکے سے ما نے محسوس کیا، یہ لڑکے... تاریخ کے ایک حصے کو -- کوئی سو ڈیڑھ سو برس کو -- معدوم کرنا چاہتے ہیں، جس کے دوران بمبئی موم بائی نہیں رہی تھی، کچھ اور بن گئی تھی... بمبئی بن گئی تھی۔

شاید آنے والے وقت کو تو کسی طرح روکا، یا بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن آدمی کی یہ کیسی آرزو ہے؟ شاید سب سے طاقت ور سب سے لاحاصل آرزو۔ ماضی کو مٹا دینے کی۔

"تم مسلمانوں سے... کیوں نفرت کرتے ہو؟" ما نے دھرمانند سے پوچھا۔ وہ ایک ریستوران

میں چائے پی رہے تھے۔ دھرمانند انھیں اپنے شاکاہاری ریستوراں میں نہیں لے گیا تھا جہاں اسے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا ہونا پڑتا۔

"ناٹ ایٹ آل میڈم!" دھرمانند نے مستعدی سے کہا۔ "لیکن ہم چاہتے ہیں وہ ہم میں گھل مل جائیں۔ دے شوڈ فیل مراٹھا۔۔۔ ہمیں ان کی پریئر پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر جیسا کہ شری بال ٹھاکرے نے کہا ہے۔۔۔ وہ ہمارے تہواروں میں شامل ہوں۔۔۔ ہم ان کے تہواروں میں شامل ہوں گے۔"

"مگر اس کا یہ طریقہ تو نہیں ہے!" کہتے کہتے ما نے زبان روک لی۔ کیا کہتا کوئی اس بچّے سے؟ پھر اسے ایک دلچسپ سا خیال آیا۔

"تم جانتے ہو مسلمانوں کی پریئر کیا ہوتی ہے؟"

"یس میڈم۔۔۔ میرے کالج میں بھی پڑھتے ہیں مسلمان لڑکے۔"

"دوست ہیں تمھارے؟"

"نہیں۔۔۔" اس نے جھجھک کر کہا۔ پھر پریشان ہو کر بولا، "وہ لوگ دوسری طرح کے ہیں۔ وہ ہم سے دوستی کرنا ہی نہیں چاہتے۔"

"تم کرنا چاہتے ہو؟"

دھرمانند حیران ہو گیا۔ وہ کچھ بھی نہ بولا۔ میز کو انگلیوں سے بجانے لگا۔

"تو۔۔۔ ان کی پریئر کے بارے میں تمھیں کیسے پتا چلا؟"

"میں نے دیکھی ہے!" دھرمانند نے فوراً کہا۔

"دیکھی ہے؟" ما نے حیرت سے کہا۔ اس کے ذہن میں "سمجھنے" کا خیال تھا۔ ایک لمحے میں اس پر جیسے کوئی انکشاف سا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی تو ہیں لوگ۔۔۔ بس دیکھتے ہیں!

دھرمانند کہہ رہا تھا،

"وہ کسی بلڈنگ کی طرف منھ کر کے کھڑے ہوتے ہیں، جو عرب دیش میں ہے۔ ہاتھوں کو سینے پر باندھتے ہیں۔ کانوں کو چھوتے ہیں۔ پھر آدھے جھک جاتے ہیں۔ پھر کھڑے ہوتے ہیں۔ کانوں کو چھوتے ہیں۔ پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ماتھا ٹیکتے ہیں گراؤنڈ پر۔ لیکن ہماری طرح نہیں۔۔۔ ان کی بیک سائیڈ کافی اونچی ہو جاتی ہے!" دھرمانند کچھ شرما کر، ہنس کر کہا۔

دادر کے ایک سستے، شاکاہاری ریستوراں میں بیٹھے، پلاسٹک کی میز پر اپنے سامنے چائے کی پیالیاں رکھے، ایک سناٹے میں آنکھیں پھاڑے، با اور ما نے ایک سترہ اٹھارہ سال کے مراٹھے سانولے لڑکے سے، جس کا نرخرہ بات کرنے سے اوپر نیچے ہو رہا تھا، اور جو اتنا کم عمر تھا، کہ اس کا دل زیادہ میلا، کینہ بھرا نہیں ہو سکتا تھا، یہ سنا کہ مسلمان اسے کیسے نظر آتے ہیں۔

دھرمانند تجسس سے پوچھ رہا تھا،

"کانوں کو کیوں چھوتے ہیں باربار میڈم؟"

با اور ما سناٹے سے نکلے۔ جیسے وہ صدیوں سے چپ بیٹھے تھے، جیسے ان کے منھ میں ریت بھر گئی تھی۔ اور بڑبڑا کر کچھ آئیں بائیں کہا: "پتا نہیں،" وہ بڑبڑائے۔ اور پھر دھرمانند سے رخصت ہو کر، سرپٹ اپنے فلیٹ کی طرف دوڑ پڑے۔

اس رات، سونے سے پہلے، بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے، ما نے کہا:

"نئی نسل مسلمانوں کی تہذیبی اقدار سے افسوس ناک حد تک لاعلم ہے۔"

با سونا چاہتا تھا۔

"روحانی اقدار کا کچھ مظاہرہ بھی نہیں ہو رہا ہے!" اس نے مکھی سی اڑائی۔

"اور ان کی طرف سے ہو رہا ہے مظاہرہ؟" ما تلملائی۔ وہ کہنی کے کنارے تقریباً بیٹھ گئی۔ "یہ جو کرشن جی کے کھلے منھ میں بجلی سے گلوب گھماتے ہوئے جلوس نکالتے ہیں؟ بھٹی کہا تھا کسی نے کہ کرشن کے دہن میں تو کُل کائنات ہے--- تو یہ سمجھا ہے اس کا مطلب!"

"بات دراصل یہ ہے کہ---" با اونگھتے ہوئے بولا: "کہ روحانی اقدار کا مظاہرہ---" اس نے سوتے ہوئے کہا: "شاید ہو نہیں سکتا۔"

ما دیر تک جاگتی رہی۔ سُن سی لیٹی تھی: با کی کہی ہوئی بات پر بےبسی سے حیران۔ واقعی--- اس نے اندھیرے میں سوچا--- اسے اپنی استانی جی کا خیال آیا، جن کے لیے اس کی ماں کہتی تھیں: "خدا جنّت نصیب کرے!" جنّت--- جہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں، اور موتیوں کے محل ہیں---

ما سوچتی سوچتی سو گئی۔

صدی کے آخر میں، بعد کے آنے والے مفسّرین یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنے والے تھے کہ جنّت دراصل خلا میں بنے ہوئے کھاد اور مٹّی کے کسی باغ کا نام نہیں تھا، اور نہ وہاں کھجور کے درخت تھے، بلکہ یہ روحانی مسرت اور طمانیت کا ایک حسین استعارہ تھا جو نیک انسان کی روح کو محسوس ہو سکتی تھی۔ شاید ان زیادہ خیال پرست مفسّرین کو شرمندگی ہوئی ہو کہ ان کے منزّہ مذہب سے خلا میں بنے ہوئے ایک باغ کا تصور منسوب کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ تفسیریں اس گول، خلا میں چکراتی دھرتی پر جہاں تہاں بستے کروڑوں مسلمانوں تک پہنچ بھی نہ سکیں گی اور وہ ہمیشہ یوں ہی اپنی سیاہ آنکھوں سے ستاروں اور چاند سے جگمگاتے بےکراں خلاؤں کو تکتے اسی جنّت پر یقین کرتے رہیں گے جہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں، اور جہاں بال سے بھی باریک ایک پُل پر سے ایک بکرے کی پیٹھ پر بیٹھ کر گزرا جا سکتا ہے جس کی وہ ہر سال عیدالاضحی کے موقعے پر قربانی دیتے ہیں۔

طیّب بھائی دکھی اور اداس بیٹھے تھے۔ وہ بھیونڈی اور مالیگاؤں کا دورہ کر کے آئے تھا۔ حکومت یا کسی سرکاری ادارے نے ان کی ذرا مدد نہ کی تھی۔ حالاں‌کہ کاغذی کارروائیوں میں

فرقہ واریت کی آگ بجھانے والی تنظیموں اور افراد کی مدد کی سرخیاں، منصوبے اور دعوے، اور سرکاری دفتروں میں اس کھاتے میں خرچ ہونے والی رقومات کی فائلوں کا انبار موجود تھا۔ طیّب بھائی اپنے ہی مراٹھا ہندو دوستوں کی مدد سے یہ دورہ کر سکے تھے جو ان علاقوں میں صلح صفائی اور حالات کو معمول پر لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"افسوس ناک صورت حال ہے اب تک..." طیّب بھائی نے گہرے دکھ سے کہا۔ "بےاعتباری تو اتنی ہے کہ کچھ پوچھیے نہیں۔ ایک گاؤں کے تمام مسلمان ایک مسجد میں اور سارے ہندو ایک مندر میں چھپے ہوئے ہیں۔"

"آپ گئے تھے وہاں؟ مسجدوں اور مندروں میں؟"

"ہاں، ہم سب گئے تھے۔" پھر وہ کچھ یاد کر کے مسکرائے۔ "مسلمان مارے ڈر کے ساری رات نعرے بلند کرتے رہے۔"

"کیسے نعرے؟"

"نہیں، کچھ اور نہیں۔ نعرۂ تکبیر۔"

"اچھا۔"

"اور ہندوؤں نے کہا... مسجد سے بلند ہوتے نعروں سے ان میں ہراس پھیل رہا تھا۔ مارے ڈر کے انہوں نے بھی نعرے لگائے رات بھر۔"

شوسینا میونسپل الیکشن حال ہی میں جیتی تھی۔ بائیس تئیس برس کے لڑکوں کی فوج جب مسلمانوں، تاملوں، گجراتیوں سے نہ لڑتی ہوتی تب، زمانۂ امن میں، "صفائی" کا کام کرواتی۔ انہوں نے کئی چالیوں میں لیٹرینیں بنوائے۔ اور کپڑے دھونے کی جگہیں۔ گلیوں میں ڈسٹ بن رکھوا دیے تھے انہوں نے۔ چالیوں میں اپنے ممبروں کی کمیٹیاں بنا دی تھیں۔ ایک ایک چالی میں کئی کئی، پندرہ تک کمیٹیاں بن گئی تھیں۔

وہ کچھ دن صفائی وغیرہ کرتے رہے۔ پھر بور ہو کر چھوڑ چھاڑ دیا۔ بمبئی میں ان کی تنظیم اتنی وسیع نہ تھی کہ وہ یہ کام شہر بھر کے پیمانے پر کر سکتے۔ ہاں لوگ، سارے مراٹھے، تقریباً سارے ہی، ان کے ساتھ تھے۔ اور ووٹ بینک انہی کا تھا۔

یہ تحریک جو غریب مراٹھوں کو مقناطیس کی طرح کھینچ رہی تھی، ایک سنہرے خواب میں لپٹی تھی۔ مراٹھا قومیت کی تجدید کا خواب، جس کی طلائی دھند میں، سواجی مرہٹہ ایک سفید گھوڑے پر سوار، دو پھل والی تلوار بلند کیے، دور کہیں بادلوں میں پرچم لہرا رہا تھا۔ ان کے دلوں میں کامل یقین تھا کہ وہ حق پر ہیں۔ ناانصافیاں ان کی آنکھوں کے سامنے تھیں۔ باہر سے آنے والے، غیرہندو، غیرمراٹھے امیر ہو گئے تھے۔ جو امیر نہ تھے، کم از کم کھاتے پیتے تھے۔ ان گنت فیکٹریاں اور کارخانے... کیا بےروزگار مراٹھے یہاں ملازمت نہیں پا سکیں گے؟ یہ سب کچھ ان کا اب نہیں ہو جائے گا؟ یہ جو ان کی اپنی سرزمین پر بسا ہے؟ اور انہیں کوئی یہ یاد دلانے والا نہیں تھا کہ یہ بھرپور، صنعتوں سے دھڑکتا ہوا، مہانگر بمبئی، سو ڈیڑھ سو برس

میں، روزگار کی تلاش میں باہر سے آنے والوں ہی نے بنایا تھا۔ معیشت کی اندھی اور بہری قوتوں نے، جو افسوس نہ مراٹھا تھیں اور نہ ہندو۔

شوسینا صوبائی انتخابات بھی جیت گئی تھی۔ لیکن کسی جادو کی چھڑی کو جنبش دے کر لاکھوں مراٹھا نوجوانوں کو روزگار تو نہیں دے سکتی تھی۔ پھر اب شوسینا کیا کرے؟ کیا تبدیلی لائے؟ آخر لیڈروں کی سمجھ میں آیا کہ بمبئی کی مراٹھیت بحال کرنے کے لیے بمبئی کو موم بائی کہنا چاہیے، جو کہ اس کا قدیم نام ہے۔ انھوں نے مہاراشٹر پارلیمنٹ میں یہ قانون بھی منظور کرا لیا۔ کچھ دنوں تک مراٹھا نوجوان بمبئی کے گلی کوچوں میں جوش بھرے نعرے لگاتے گھومے:

"بمبئی نہیں، موم بائی"

راجیو گاندھی جب بمبئی آئے تو پرچموں میں تحریر کیا گیا:

"ہم آپ کا خیرمقدم کرتے ہیں۔ بمبئی میں نہیں، موم بائی میں۔"

لیکن کچھ دن بعد، حالات پھر جوں کے توں ہو گئے۔ جو لوگ، اندرون مراٹھالینڈ، بمبئی کو موم بائی کہتے تھے وہ موم بائی ہی کہتے رہے۔ اور جو بمبئی کہتے تھے وہ بمبئی ہی کہتے رہے۔

آخر حکومت نے قانون کو سچ مچ رائج کرنے کے لیے محکمۂ ڈاک کو استعمال کرنے کی ٹھانی۔ لہذا یہ نوٹیفکیشن نکالا گیا کہ آئندہ صرف وہی ڈاک پہنچائی جائے گی جس پر موم بائی لکھا ہو، بمبئی نہ لکھا ہو۔

اس حکم سے بمبئی کا ڈاک کا نظام بری طرح درہم برہم ہو گیا۔ ایشیا کا یہ گرانڈیل تجارتی اور صنعتی مرکز ہر روز ہزاروں کی تعداد میں بیرون ملک سے خطوط اور پارسل اور تار وصول کرتا ہے۔ غلطی کا احساس ہوتے ہی دو دن میں یہ حکم واپس لے لیا گیا۔ اس کی جگہ یہ نسبتاً نرم حکم نکالا گیا کہ خیر انگریزی میں بمبئی چلنے دیا جائے، لیکن ہندی میں موم بائی ہی قابل قبول سمجھا جائے گا۔

لیکن یہ قانون نافذ نہ ہو سکا۔ مہاراشٹر کی حکومت کسی دوسرے صوبے پر اپنا قانون نافذ کرنے کی مجاز نہ تھی، اور کسی دوسرے صوبے، مثلاً اتر پردیش یا راجستھان میں رہنے والے کسی شہری کو بمبئی کو موم بائی کہنے یا لکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ اور دوسرے کسی راشٹریہ نے، مہاراشٹر حکومت کے اس قانون میں ذرہ برابر دلچسپی یا ہمدردی کا چنداں اظہار نہیں کیا۔

("بشنما" غالباً انھوں نے کہا۔)

بال ٹھاکرے کی تحریک اور فسادات کا کل حاصل جمع ضرب صرف یہی نکل سکا۔

مگر اس تحریک میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ سنہرے خواب کے سنگ اصلاحی امنگ، جسے نوجوان مراٹھوں نے حقیقت کا روپ دینے کی جی جان سے کوشش کی تھیں۔ انھوں نے جات پات کی سخت درجہ بندیاں ختم کرنے کی کوشش کی اور امبیدکر کو اپنا ہیرو مانا اور پارٹی کے دفاتر میں ان کی تصویریں آویزاں کر دیں۔ امبیدکر ۔۔ کانگریس کے بنیادی کارکن، ہندوستان کا

آئین تحریر کرنے والے مراٹھا اچھوت۔۔۔

شوسینا کے جوانوں نے چھوت چھات کی تقسیم ختم کرنے کی کوشش کی۔ سورن جاتی کے ہندو مراٹھوں نے ہاتھ میں جھاڑو اٹھائی اور گلی گلی خود جھاڑو دی۔ لیکن پوری جان لڑا کر بھی وہ خود کو لیٹرین صاف کرنے پر آمادہ نہ کر سکے۔ فضلہ اٹھانے کا کام انھیں بھنگیوں ہی کو سونپنا پڑا جنھیں ہندوستان کے بڑے شہروں میں اب سرکاری طور پر "ہری جن" کہا جاتا ہے۔ جانے کس رومانی لہر میں، گاندھی جی نے انھیں یہ نام دیا تھا۔

امبیدکر ہری جن نہیں رہے تھے۔ ہندوستان کے آئین میں اپنے قلم سے، ایک کمرے کی تنہائی میں، معمولی میز کرسی پر بیٹھ کر یہ لکھ کر: "اور اس دیش میں اب نہیں ہو گی کوئی چھوت چھات شودروں کی طرف۔" امبیدکر نے ہندومت چھوڑ دی تھی۔ وہ بُدھسٹ ہو گئے تھے۔ جیسے ان کے دل سے کوئی آہ نکلی تھی آدمی کی نیک خواہشوں کی اکل ناکامی پر، جسے اس کا لاشعور جانتا ہے۔

شوسینا نے شودروں کو مراٹھا قوم میں باعزت جگہ دینے کی پوری کوشش کی تھی (جیسی سواجی مرہٹہ کے زمانے میں ہوئی)۔ مراٹھوں میں سوراج سے قبل کے زمانے میں بھی سواجی مرہٹے کی یہ تحریک بہت مقبول ہوئی تھی۔ لیکن اس کا ایک عجیب و غریب، ناقابلِ وضاحت شاخسانہ، اس تحریک کے فوراً بعد براروں مراٹھا شودروں کا ہندومت چھوڑ کر بدھ مت اختیار کر لینا بھی تھا! ہندومت میں باعزت مقام دینے کی کوشش پر انھوں نے ہندومت چھوڑ دیا۔

•

"مگر یہ تو حیرت انگیز بات ہے۔" ما نے سنچری بازار کے پاس مسٹر گوینکر سے کہا تھا۔ "بھگتی تحریک مہاراشٹر سے شروع ہوئی! میں نے زندگی بھر سمجھا کہ وہ تو کبیرداس سے۔۔۔"

"ہوئی تھی -- مہاراشٹر سے۔ مگر یوپی کے بھئے مانیں بھی تو! نہیں مانتے۔"

"کیا کہتے ہیں؟"

"کرونولوجی کو تو ظاہر ہے، جھٹلا نہیں سکتے۔"

"تب پھر؟"

"بس یہی موقف ہے کہ مہاراشٹر میں چلی ہو گی بھگتی تحریک۔ لیکن ہندی بیلٹ والی تحریک کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہماری اپنی الگ چلی تھی۔ اپنی ہی وجوہات سے۔ باضابطہ کتابیں ہیں اس موضوع پر۔" مسٹر گوینکر نے کھکھوڑ کر کتابیں اس کے سامنے ڈال دیں۔ ایک کتاب کھول کر صفحے پر پنسل سے سرخ نشان لگایا۔ ما نے نثری ٹکڑے پر نظر ڈالی۔

"اب گو کہ یہ کہا جاتا ہے کہ مہاراشٹر میں۔۔۔ مگر چونکہ۔۔۔ چنانچہ۔۔۔ گویا کہ۔۔۔ حالانکہ۔۔۔ بس تو ثابت ہوا۔۔۔ ہماری اپنی الگ تحریک تھی۔ جس کا بھی پیغام تھا۔۔۔ محبت۔۔۔ لیکن بالکل الگ تحریک۔۔۔ اس کا کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا!"

ما قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ پیغامِ محبت پر شدید اختلاف! ما نے سوچا۔

ooo

بمبئی میں کہاں کہاں سے خلقت اُمڈی آتی ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں سے! اور وہ سب ایک بار شاید جُوہُو کے ساحل پر بھی آتے ہوں۔

ریت پر بچے رنگین بڑی بڑی گیندوں سے کھیل رہے تھے۔ نرم ریت میں دھنسی رنگ برنگی چھوٹی کشتیاں کھڑی تھیں۔ ساحل پر تیرنے والے ٹائر پڑے تھے۔ تفریح کے لیے آئے لڑکے اور لڑکیاں ٹائروں کو لڑھکاتے لہروں کی طرف دوڑ جاتے اور ان پر بیٹھ کر لہروں پر ڈولنے لگتے۔ لہروں کو دیکھ کر ننھی ککلی چڑیا کی طرح چہچہانے لگی تھی۔

بادلوں بھرے آسمان تلے بس سے اتر کر، نرم ریت پر بیٹھنے کا کوئی مناسب ٹھکانا بناتے بناتے ما کا پورا کنبہ تتربتر ہو چکا تھا۔

رانوں سے اونچی اسکرٹیں پہنے دو بمبیّا لڑکیوں کو بھیل پوری کے خوانچے کی طرف جاتے دیکھ کر با، بچوں کے لیے بھیل پوری لانے کا اعلان کر کے، کسی جواب کا انتظار کیے بغیر، دور، بہت دور جا چکا تھا۔ اب وہ پام کے پیڑوں کے مورپنکھوں جیسی ہری، سلوٹ دار چادر پر ایک چھوٹا سا نقطہ تھا۔

کنارے کے ساتھ ساتھ چلتی، نازک سی پھول گاڑی، جس میں دو خوبصورت ٹٹو جُتے ہوئے تھے، اسے دیکھ کر بڑکی نے خوشی سے چیخ ماری تھی۔

"پھولوں کی گاڑی، ما! وہ... وہ... وہ دیکھو... نیتو سنگھ اسی میں تو بیٹھی تھی، فلاں فلم میں... آپ نے نہیں دیکھی؟ کونل کپور کے ساتھ؟ جب وہ گانا گایا تھا انھوں نے؟"

بندریا کی طرح چپڑ چپڑ کرتی، اشتیاق سے بےتاب، کونل کپور اور نیتو سنگھ کا گانا گاتی بڑکی پھول گاڑی میں سواری لینے دوڑ پڑی تھی۔

ریت پر رینگ رینگ کر چیکو نیکر میں پیشاب کر کے رویا تھا اور پھر دونوں مٹھیاں بھر بھر کے پیشاب میں بھری ریت کھا چکا تھا۔

اور ککلی...

ما نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ ککلی کہیں نہیں تھی۔

ما کے سینے سے ہوائی سی نکلی۔

"ککلی کہاں... کہاں گئی ککلی؟"

وہ تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہوئی، چاروں طرف دیکھ رہی تھی اور ککلی اسے کہیں نہیں دکھ رہی تھی۔

تب ہی دور... بہت دور لہروں کے سپید جھک جھاگ پر ککلی کا لال اور نیلا ربن، شفاف نیلی ہوا میں لہراتا دکھائی پڑا۔ ککلی کا ربن!

ریت کھاتے چیکو کو ریت پر پھینک کر، کھانے کے سامان اور باسکٹ گرا کر، دوپٹا جھٹک کر، ہوا میں اڑا کر، ما بےتحاشا لہراتے ربن کی سمت بھاگی۔ دونوں بازو پرندوں کی طرح

پیچھے کیے ما پوری طاقت سے دوڑ رہی تھی، ہوا کے زناٹے کو چیرتی--- بنا کسی سے پوچھے ککلی دوڑ گئی تھی اور کنارے پر پڑے تیرنے والے ٹائروں میں سے کسی ایک کو دوڑاتی لہروں تک جا پہنچی تھی۔ دوسروں کی دیکھادیکھی، اپنے سے بہت بڑی عمر کے لڑکے اور لڑکیوں کی نقل میں، ٹائر پر بیٹھ کر لہروں میں اتر گئی تھی۔

دو تین سانسوں میں ما پانی کے اندر تھی۔ شڑپ شڑاپ ما نے پانی میں دوڑ لگائی۔

پہلے گھٹنوں تک، پھر کمر تک، پھر اس کے سینے تک آیا پانی۔ جیسے کئی ہزار ٹن ریت کی بوریاں۔ پانی اتنا بھاری ہوتا ہے؟ یہ تو ما کو خبر ہی نہ تھی۔ اس کے کپڑے شرابور ہو کر کئی ٹن وزنی ہو چکے تھے۔ آنکھوں میں اور منہ میں نمکیلا پانی چھپاک چھپاک پڑ رہا تھا۔

"ککک--- لی---" اس نے پھیپڑوں میں ساری ہوا بھر کر آواز لگائی۔ مگر ہوا نے اس کی آواز کو بکھیر دیا۔ ایک لہر نے اس کے منہ پر زوردار تھپیڑا مارا۔ ما کے گھٹنے مڑ گئے۔

ایک بانہہ کے فاصلے پر ککلی کا ٹائر ہچکولے لے رہا تھا۔ منوں وزنی پانی کو چیر کر ما نے دونوں بانہیں اٹھائیں کہ ککلی کو جھپٹ لیں۔

پانی کے شور کے اوپر، ہوا میں، اوپر ہی اوپر اٹھتی کئی آوازوں نے اسے روکا۔

"نہیں بائی--- نہیں--- بچّے کو ٹائر سے اتارو نہیں۔"

ما نے دونوں بانہیں ٹائر کے حلقے میں ڈال دیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو بیسیوں لوگ اس کے پیچھے پیچھے پانی میں دوڑتے، تیرتے چلے آ رہے تھے۔ ما کو بدحواسی سے چیختا اور دوڑتا دیکھ کر آس پاس کھڑے لوگ، تفریح کے لیے آئے ہوئے سیاح اور خوانچے والے اس کی مدد کے لیے دوڑ پڑے تھے۔ کئی بانہوں نے ٹائر کو سہارا دے دیا۔ آہستہ آہستہ ٹائر کو ٹھیلتے وہ اسے کنارے کی طرف لا رہے تھے۔

اتنے گہرے پانی میں ما ککلی کو ٹائر سے اتار لیتی تب تو شاید وہ دونوں توازن نہ رکھ پاتے۔

ککلی بسورنا بھول کر، چھپ چھپ پانی میں ٹانگیں چلا رہی تھی۔ چڑیا کی جیسی چہچہا رہی تھی۔ ٹائر پر جمی۔ کسی جل بالکا سی -- اس کی شیدیانی، اس کی ہیڈماسٹریانی -- کتنے ہی سانولے، چھریرے بدن جس کی جل گاڑی کھینچ رہے تھے۔ ان کے نیلے پیلے لال لنگوٹ اور جانگیے، سرمئی لہروں میں ابھر اور ڈوب رہے تھے۔

نمکیلے پانی میں بھیگی، ننگے بدنوں کے اس ریلے میں پھسلتی آ رہی تھی ما۔ کچھ خود چلتی اور کچھ دھکیلی جاتی ہوئی۔ آوازوں کے شور میں۔ سمندر کی اور ہنسی کی ملی جلی آوازوں میں، ما کے ذہن میں آہستہ آہستہ یہ بات آئی، جیسے ہولے ہولے پانی کی تہہ میں ریت بیٹھتی ہو۔

ککلی نے جو اب تک اسے کبھی نہیں ستایا تھا، کبھی کسی پریشانی میں نہ ڈالا تھا، تو اِس لیے۔ ککلی نے ابھی تک سمندر دیکھا ہی نہ تھا! اور اب---

ooo

"اب میری باری ہے!"

ما نے کہا۔

ککلی اور چیکو اور چولھے پر چڑھی ہانڈی کو بڑکی کے حوالے کر کے آج وہ سمندر کے کنارے خود گھومنے آئی تھی۔ بڑکی نے رات اس کے منھ پر کریم مَلی تھی۔ صبح کو چہرہ نرم اور تازہ محسوس ہو رہا تھا۔

اس نے آئینے میں اپنا آپ دیکھا تھا، اور وہ اسے ٹھیک نظر آیا تھا۔ فکروں کا بوجھ اتار کر، فکروں کی ایک پوٹلی باندھ کر، جیسے گھر پر چھوڑ کر، ما نے اپنے حصّے کا ایک دن وصول کیا تھا۔

ساری دنیا، اور تقریباً اپنےآپ، سے چھپا کر اس نے اپنے لیے ایک شوخ بھڑک دار ڈریس خریدا تھا، جو اس نے شرم کے مارے اپنے بیگ میں چھپا رکھا تھا۔

با پوری دلجمعی سے اسے جوہو لے چلا۔ جوہو پر، نہانے کی زنانہ کیبن میں جا کر ما نے کپڑے بدلے۔ باہر آئی تو با اس کے بھڑک دار کپڑے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کپڑوں کی کیبن میں وہ جوتے، ہینڈبیگ، سب چھوڑ کر آئی تھی۔ بالکل ہلکی پھلکی ہو کر۔

با نے اور ما نے ساحل پر مونگ پھلیاں کھائیں۔ بانہہ میں بانہہ ڈال کر فوراً اترنے والی تصویر کھنچائی۔

تصویر میں با اور ما نے اپنے آپ کو دیکھا۔ با کے چہرے پر شرمندہ سی بزدلی کا تاثر۔ اور ما کے بھڑک دار کپڑوں کو بالکل مائنس کرتا ہوا اس کا چہرہ، جس پر نامرادی کی پھٹکار پڑ رہی تھی۔ تصویر کو دیکھ کر دونوں شرمندہ ہو گئے۔ با نے تصویر بٹوے میں ڈال لی۔

ما پانی میں چلنے لگی۔

شپ شپ، شڑاپ شڑاپ۔

اس نے مڑ کر با کی طرف دیکھا۔

"آؤ---"

اس نے کہا۔

"کپڑے بھیگ جائیں گے۔"

"بھیگ جائیں!"

"بٹوا -- بٹوا بھی تو بھیگ جائے گا۔ جوتے کہاں رکھوں؟"

"یہیں کنارے پر چھوڑ دو سب کچھ۔"

با نے پتلون کے پائنچے چڑھائے، جوتے ہاتھ میں تھامے، اور ما کے ساتھ ساتھ آنے لگا۔ ما کو با کی حالت پر افسوس ہوا۔ اس کے پاس بہت بوجھ تھا، اور وہ اپنا بوجھ کسی چھوٹے سے خانے میں تالا لگا کر کنارے پر چھوڑ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ما پانی میں دوڑ لگانے لگی۔

وہ ہاتھ لہرا کر گانے لگی۔ اس نے اسی پل ایک گانا جوڑا تھا۔

"سمندر کی طرف آؤ
تو کچھ ہاتھوں میں مت لانا
سمندر تم کو
کچھ نہ کچھ دے گا
نہیں تو
کچھ نہیں دے گا"

یہ آخری حقارت بھری دھمکی ما کی طرف دیکھ کر۔

"تمبنی میں ملو گی مجھ سے؟"
"جی ہاں ضرور۔"
"تھوڑا گھومیں گے۔ ساتھ سنتر کریں گے۔ جوہو چلیں گے۔"
"اور... آپ کی بیوی؟"
ما سو نہیں رہی تھی۔ ما تو صرف آنکھیں موندے دیوار کی طرف منھ کیے لیٹی تھی۔ ما سے ملنے آنے والی صحافی لڑکی سے با جو باتیں کر رہا تھا ما سب سن رہی تھی۔
"ما؟ اس کا کیا ہے۔ وہ تو مجھے اپنے پلو سے باندھے رکھنا چاہتی ہے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

ما نے با کو غور سے دیکھا۔ کیا وہ اسے اپنے پلو سے باندھے رکھنا چاہتی ہے؟ اس نے خود سے پوچھا۔ پھر پانی اچھالتے ہوئے محسوس کیا کہ بالکل! وہ ایسا ہی چاہتی ہے۔
کیوں؟
پانی اب اس کی کمر کمر تک آ گیا تھا۔ لہریں زور پکڑ رہی تھیں۔ وہ جی جان سے پانی کو اپنے بدن سے لپ لپ ٹکراتا محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ ایک بڑی لہر کو اس نے اپنے پیٹ سے چھپاک سے ٹکراتا محسوس کیا۔ اس کے پیر پھسل گئے۔ بانہیں بڑھا کر اس نے با کو تھاما۔
نظر اٹھی تو با کی نگاہوں میں اسے ایک غیرمتوقع حسرت نظر آئی۔ ما نے نظریں جھکا لیں۔
با جوہو آنا چاہتا تھا۔ اس کے بغیر۔ وہ زندگی کا لطف لینا چاہتا تھا۔ اگر ما کے بدلے وہ اس انجانی لڑکی کے ساتھ آتا تو شاید اپنے جوتے اور بٹوا سناں گھر کی کیبنٹ میں خود بند کر

کے آتا۔ وہ ما کی نگاہوں سے دور، بےفکری سے لہروں سے کھیلتا۔ آج جو اپنے بوجھ سے چھٹکارا نہیں پا سکا۔ با کا سب سے بڑا بوجھ تو وہ خود ہے۔ خود ما۔ ما با کے شعور پر ایک بھاری بوجھ ہے--- کیوں؟

اس نے با کی طرف مڑ کر دیکھا۔ فولاد سے مضبوط، مگر شیشے سے بھی شفاف، کسی انسانی آنسو کی دیوار کے پیچھے کھڑا تھا با۔ یوں‌ہی کھڑے تھے وہ دونوں--- شفاف شیشے کے آرپار ایک دوسرے کو تکتے، مگر کبھی پار نہ کرتے، نہ کر سکتے ہوئے---

ایک بڑی لہر آئی۔ ما کو اپنی بانہوں اور بالوں سے ان گنت ننھی منی مچھلیاں پھسلتی محسوس ہوئیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن سے با کا خیال محو ہو گیا۔ ایک ننھے سے پل میں اسے گوداوری کا خیال آیا اور اس کے تصور نے مرائھن کو، لمبی لاٹھی تھامے، سرخ پہاڑ پر چڑھتے دیکھا۔ لمحے بھر کو اس نے آشا کو تاریک کوٹھری کے دروازے سے سر ٹکائے، ستار جیسی ہنسی ہنستے سنا، جس کے عقب میں زرد روشنی میں دیوار پر گیرو سے بنے دیوی دیوتاؤں کے نقش چمک رہے تھے۔ سمندر کی اونچی نمکیلی لہر میں بہتا ایک سوکھا آبی پودا اپنے سینے سے جدا کرتے ہوئے اس نے کچھ اور اہم باتوں کے بارے میں سوچا جن کا سمبندھ موت اور زیست سے تھا۔ اسے خیال آیا کہ کس طرح بڑکی اور ککلی اور چیکو کی پیدائش کے درد جدا جدا تھے۔ کون سا والا پیٹ میں الٹ گیا تھا اور خون کا دوران بڑھ جانے کی وجہ سے کون سا پیدائش کے وقت سے دو ہفتے پہلے رحم کا پانی توڑ کر پیدا کیا گیا تھا۔

لہروں میں شپ شپاتی ما کافی دور تک گئی۔ اکیلی۔

ooooo